بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہمارے دینی مدارس

چند اہم سوالات کا جائزہ

ابو عمار
زاہد الراشدی

الشریعہ اکادمی
گوجرانوالہ، پاکستان
www.alsharia.org

جملہ حقوق محفوظ!

عنوان : ہمارے دینی مدارس: چند اہم سوالات کا جائزہ
تالیف : ابوعمار زاہد الراشدی
مرتب : محمد عمار خان ناصر
ناشر : الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، گوجرانوالہ
اشاعت : اگست ۲۰۰۷ء

فہرست

- دینی مدارس اور زندگی کا ایمانی وروحانی پہلو ۵
- دینی مدارس کے جداگانہ نظام ونصاب کا مقصد ۱۱
- دینی مدارس کے بارے میں پانچ سوالات کے جوابات ۱۷
- پاکستان کے دینی مدارس اور دہشت گردی ۳۳
- دینی نظام تعلیم: مثبت اور منفی پہلو ۳۷
- دینی مدارس کا نصاب تعلیم اور جدید تقاضے ۵۵
- فکری ومسلکی تربیت کے چند ضروری پہلو ۶۳
- ائمہ مساجد اور علمائے کرام کی معاشرتی ذمہ داریاں ۷۱
- دینی تعلیم کے مختصر کورسز۔ ضرورت واہمیت ۷۷
- محراب ومنبر کے وارث اور محنت مزدوری ۸۳

دینی مدارس اور زندگی کا ایمانی وروحانی پہلو

[جامعہ خالد بن ولید، ٹھینگی ضلع وہاڑی میں ایک اجتماع سے خطاب]

دینی مدارس کو جن تحدیات اور چیلنجز کا آج کے دور میں سامنا ہے، اس کے مختلف پہلو ہیں اور متعدد رخ ہیں جن میں سے میرے نزدیک سب سے اہم پہلو فکری اور نظریاتی تحدیات کا ہے اور چونکہ میری جدوجہد کا شعبہ یہی ہے، اس لیے اس کا بطور خاص تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں۔ دینی مدارس کو درپیش فکری چیلنجز بھی بہت سے ہیں جن میں ایک یہ بھی ہے کہ ان مدارس کی آخر الگ سے کیا ضرورت ہے؟ اور جب مسلمان معاشرے میں اسکول، کالج اور یونی ورسٹیاں موجود ہیں اور تعلیمی خدمات سرانجام دے رہی ہیں تو اجتماعی دھارے اور مین اسٹریم سے ہٹ کر یہ مدارس الگ کیا کام کر رہے ہیں اور کیوں کر رہے ہیں؟

یہ بہت بڑا سوال ہے جو پوری دنیا میں دہرایا جا رہا ہے اور بار بار دہرایا جا رہا ہے جس کا جواب دینا ضروری ہے اور نئی نسل کو مطمئن کرنا ضروری ہے، ورنہ مدرسہ کی افادیت وضرورت کے بارے میں شکوک وشبہات کا دائرہ دن بدن پھیلتا جائے گا اور ہم اس چیلنج کا صحیح طور پر سامنا نہیں کر سکیں گے۔ بدقسمتی سے ہمارا یعنی دینی حلقوں کا اجتماعی مزاج یہ بن گیا ہے کہ ہم اس قسم کے سوالات کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور انھیں بے دینوں اور ملحدوں کی بات قرار دے کر حقارت کے ساتھ مسترد کر دیتے ہیں۔ یہ درست طرز عمل نہیں ہے اور اس کے نقصانات کا ہمیں صحیح طور پر اندازہ نہیں ہے۔ نئی نسل، بالخصوص پڑھے لکھے نوجوانوں کے ذہنوں میں جو سوالات جنم لے رہے ہیں یا میڈیا جن سوالات کو پیدا کر رہا ہے، ان کا جواب نظر انداز کرنا نہیں ہے، حقارت سے ٹھکرانا نہیں

ہے اور غصے کا اظہار کر کے انھیں یہ احساس دلانا نہیں ہے کہ ان سوالات کا کوئی جواب ہی نہیں ہے، بلکہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ان سوالات کو سمجھیں، ان کے اسباب وعلل کو سمجھنے کی کوشش کریں اور پھر یہ بھی دیکھیں کہ کس انداز اور کون سے اسلوب سے ان سوالات کا جواب ان نوجوانوں کو یا پڑھے لکھے لوگوں کو مطمئن کرسکتا ہے، اس لیے کہ ہمارا یعنی دینی حلقوں کا عمومی مزاج یہ بن گیا ہے کہ کسی بھی شک وشبہ والے سوال پر اول تو ہم ڈانٹ ڈپٹ سے کام لیتے ہیں اور ٹالنے کی کوشش کرتے ہیں اور اگر کسی سوال کا جواب دیتے ہیں تو اس میں انداز، اسلوب اور اصطلاحات ہماری اپنی ہوتی ہیں جن سے آج کی دنیا مانوس نہیں ہے اور جنھیں سمجھنے کے لیے انھیں الگ سے مشقت کرنا پڑتی ہے۔

اس پس منظر میں دینی مدارس کے حوالے سے آج کے لوگوں کے ذہنوں میں پائے جانے والے سوالات میں سے ایک کا مختصر جائزہ لینا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ جب اسکول، کالج اور یونیورسٹی کے ذریعے سے تعلیم کا ایک وسیع نظام موجود ہے اور ہر سطح پر ان تعلیمی اداروں کا نیٹ ورک کام کر رہا ہے تو الگ سے ان دینی مدارس کی ضرورت کیا ہے اور اجتماعی دھارے سے الگ ہو کر یہ کس بات کی تعلیم دیتے ہیں اور جن علوم کی یہ تعلیم دیتے ہیں، سوسائٹی کی ضروریات سے ان کا کیا تعلق ہے؟ بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ دینی مدارس کی تعلیم کا سوسائٹی کی ضروریات سے کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ معاشرہ کی کوئی ضرورت پوری کرنے کے بجائے غیر ضروری علوم وفنون میں وقت صرف کر رہے ہیں۔ ان کے جواب میں یہ عرض کرتا ہوں کہ اسکول، کالج اور یونی ورسٹی ہماری بہت سی ضروریات پوری کرتے ہیں اور ان میں پڑھائے جانے والے علوم وفنون بلاشبہ سوسائٹی کی ضروریات سے تعلق رکھتے ہیں جن کی اہمیت وافادیت سے کسی درجے میں انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن یہ بھی امر واقعہ ہے کہ اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم اور ان میں پڑھائے جانے والے علوم وفنون ہماری تمام ضروریات کو پورا نہیں کرتے۔

مثلاً سائنس ہماری بہت سی ضرورتیں پورا کرتی ہے اور ہمیں کائنات کی مختلف اشیا کے بارے میں مفید معلومات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ ان سے استفادہ اور ان کے بہتر سے بہتر

استعمال کے لیے ہماری راہ نمائی کرتی ہے۔ یہ کائنات کی وسعتوں کے حوالے سے بھی ہے اور انسانی جسم اور اس کی مشینری کے حوالے سے بھی ہے، لیکن اس کی تمام تر تگ ودو صرف دو سوالوں تک محدود ہے: ایک یہ کہ یہ کائنات کیا ہے اور دوسرا یہ کہ یہ کیسے کام کر رہی ہے؟ اسی طرح انسانی جسم کیا ہے؟ یہ کیسے کام کرتا ہے اور اسے کیسے صحیح رکھا جا سکتا ہے؟ لیکن کائنات اور انسان دونوں حوالوں سے سائنس اس سوال کا جواب نہیں دیتی کہ یہ کیوں ہیں اور کس مقصد کے لیے وجود میں لائے گئے ہیں؟ اس سوال کا جواب ہمیں صرف وحی دیتی ہے اور آسمانی تعلیمات اس کا جواب فراہم کرتی ہیں اور وحی الٰہی اسکول، کالج اور یونیورسٹی کے بجائے اس دینی مدرسہ میں پڑھائی جاتی ہے۔

اسی طرح ہم اپنے اردگرد کے ماحول کو دیکھتے ہیں تو ہمارے اردگرد صرف وہی چیزیں موجود نہیں ہیں جو مشاہدات یا محسوسات کے دائرے میں آتی ہیں، بلکہ اس سے ہٹ کر بھی بہت سی چیزیں پائی جاتی ہیں جو سائنس کے دائرۂ کار سے خارج ہیں اور سائنس سرے سے ان پر بحث ہی نہیں کرتی۔ مثلاً یہ بات نہ صرف ہمارے عقیدے میں شامل ہے بلکہ تجربات ومشاہدات کا بھی حصہ ہے کہ برکت اور نحوست دونوں کا وجود پایا جاتا ہے اور یہ ہماری زندگی کا حصہ ہیں، لیکن ان کے بارے میں سائنس خاموش ہے اور ان کے بارے میں کوئی معلومات مہیا نہیں کرتی، اس لیے کہ سائنس کا دائرۂ فکر صرف میٹر تک محدود ہے۔ وہ صرف مادے اور اس کے متعلقات پر بات کرتی ہے اور برکت ونحوست مادے کے دائرے سے باہر کی چیزیں ہیں، اس لیے برکت اور نحوست کا سبجیکٹ نہ آکسفورڈ کے مضامین میں شامل ہے، نہ کیمبرج میں پڑھایا جاتا ہے اور نہ ہی ہاورڈ یونی ورسٹی اس سے بحث کرتی ہے۔ یہ مضمون آپ کو جامعہ خالد بن ولید کے نصاب میں ملے گا، مدرسہ نصرۃ العلوم کے نصاب میں ملے گا اور جامعہ اشرفیہ کے نصاب میں ملے گا۔ اسی طرح یہ بات ہمارے عقیدے کا حصہ ہے کہ ہمارے اردگرد فرشتوں کا ایک وسیع نیٹ ورک موجود ہے جو شب و روز متحرک رہتا ہے اور ہر شخص کے ساتھ کئی فرشتے مختلف حوالوں سے اپنی ڈیوٹی سرانجام دیتے ہیں، لیکن اس یونیورسل نیٹ ورک کے بارے میں سائنس ہمیں کچھ نہیں بتاتی اور کوئی معلومات

فراہم نہیں کرتی۔

پھر یہ بھی دیکھ لیں کہ اسکول، کالج اور یونی ورسٹی کی تعلیم اور سائنس وٹیکنالوجی کے علوم و فنون اپنی تمام تر افادیت وضرورت کے باوجود ہمیں جو کچھ بھی معلومات اور سہولتیں فراہم کرتے ہیں، وہ صرف اس دنیا تک محدود ہیں اور ان کی افادیت، اہمیت اور ضرورت صرف اور صرف مرنے سے پہلے تک ہے جبکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ یہ دنیا کی زندگی بہت محدود ہے اور قبر، حشر اور آخرت کی زندگی اس سے کہیں زیادہ طویل اور بے انتہا ہے۔ ہم دنیا میں فخر کرتے ہیں کہ ۶۰ سال زندگی پائی ہے، ۷۰ سال زندگی گزاری ہے اور ۸۰ سال کی زندگی سے بہرہ ور ہوئے ہیں، لیکن آخرت کی طویل زندگی کے مقابلے میں اس کی حیثیت کیا ہے؟ قرآن کریم کے ایک ارشاد سے اس کا اندازہ کرلیں کہ تمھارے ایک ہزار سال اللہ تعالیٰ کے ایک دن کے برابر ہیں۔ اس سے دیکھ لیں کہ ہمارے ستر، اسی اور نوے سال اللہ تعالیٰ کے اس دن میں کتنے گھنٹوں کے برابر شمار ہوتے ہیں اور اس دنیا کی زندگی کی حقیقت کیا ہے؟

اب ظاہر بات ہے کہ سائنس، ٹیکنالوجی اور اسکول وکالج کے علوم ہماری دنیا کی زندگی کی جتنی معلومات بھی دے دیں اور جتنی سہولتیں بھی فراہم کریں، وہ بہت محدود ہیں اور اصل زندگی کے بارے میں ہماری کوئی راہ نمائی نہیں کرتے۔ یہ راہ نمائی ہمیں وحی الٰہی سے ملتی ہے، آسمانی تعلیمات ہمیں یہ معلومات فراہم کرتی ہیں اور وہ دینی مدرسہ میں پڑھائی جاتی ہیں اور درس نظامی کے نصاب کا حصہ ہیں۔ اس لیے ہمارے لیے ان مدارس کی اہمیت زیادہ ہے۔ ہم دنیا کی ضروریات کو بہتر سے بہتر انداز سے پورا کرنے کی مخالفت نہیں کرتے، بلکہ اسے ضروری سمجھتے ہیں اور اس کے لیے اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم کی ضرورت اور افادیت کے قائل ہیں، لیکن ہماری بہت سی ضروریات جو اس دنیا کی زندگی کی ضروریات سے کہیں زیادہ وسعت رکھتی ہیں، وہ ان دینی مدارس کے ذریعے سے پوری ہوتی ہیں اور ان مدارس کا ہماری معاشرتی ضروریات سے انتہائی گہرا تعلق ہے۔

یہ میں نے صرف ایک سوال کا ذکر کیا ہے۔ اس قسم کے بیسیوں سوالات دینی مدارس کے

بارے میں اٹھائے جارہے ہیں اور ہمارے پڑھے لکھے لوگوں اور نئی نسل کے ذہنوں میں شکوک و شبہات کا باعث بن رہے ہیں جن کا سامنا کرنا اور عمدہ اسلوب کے ساتھ ان کانٹوں کو ذہنوں سے نکالنا ہماری ذمہ داری ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنی دینی جدوجہد اور دینی مدارس کے حوالے سے اپنے فرائض صحیح طور پر سرانجام دینے کی توفیق ارزانی فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

دینی مدارس کے جداگانہ نظام ونصاب کا مقصد

بعض دوستوں نے مجھ سے وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی طرف سے کی گئی دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں حالیہ ترجیحات اور اضافوں کے بارے میں دریافت کیا ہے جس پر میں نے ان سے عرض کیا ہے کہ ابھی ان ترجیحات اور اضافوں کا کوئی باقاعدہ پیپر ورک میری نظر سے نہیں گزرا۔ وفاق کے ناظم اعلیٰ مولانا محمد حنیف جالندھری نے ایک ملاقات میں بھجوانے کا وعدہ کیا تھا اور میں اس کے انتظار میں ہوں، اس کے مطالعے کے بعد ہی کوئی رائے دے سکوں گا۔ البتہ دینی مدارس کے جداگانہ نظام ونصاب کے اہتمام سے ہمارے اکابر اور بزرگوں کا جو مقصد تھا اور اس حوالہ سے ان کے ذہنوں میں جو اہداف تھے، ان میں سے بعض امور کا تذکرہ اس موقع پر کرنا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ ہم اس سلسلہ میں جو قدم بھی اٹھائیں، اس میں وہ اصل مقاصد واہداف ہمارے پیش نظر رہیں جو دینی مدارس کے اس جداگانہ نظام ونصاب کے بارے میں ہمارے اکابر اور بزرگوں کے ذہن میں تھے۔

اس نظام ونصاب کی تدوین وتشکیل میں ہمارے اکابر کا اصل مقصد اس معاشرہ میں مسجد و مدرسہ کے اداروں اور دینی تعلیم وتربیت کے فروغ کی ضروریات کے لیے رجال کار کی فراہمی تھا اور ان کے پیش نظر یہ بات تھی کہ معاشرہ کی دینی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے تعلیم یافتہ حضرات ہر جگہ عام مسلمانوں کو ملتے رہیں اور اس کے ساتھ ہی ان کی یہ خواہش بھی رہتی تھی کہ ذہین افراد اس شعبہ کو زیادہ سے زیادہ میسر رہیں تاکہ مسجد ومدرسہ اور دینی تعلیم وتربیت کا نظام کسی خلا اور تعطل کے بغیر چلتا رہے۔ اسی مقصد سے ہمارے ہاں اس بات کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے کہ

دینی مدارس میں تعلیم حاصل کرنے والے حضرات جدید تعلیم کے شعبوں کی طرف متوجہ ہوں کیونکہ اس میں یہ خطرہ رہتا ہے کہ چونکہ دوسری طرف ملازمت کا تحفظ، مراعات اور سہولتیں زیادہ ہیں، اس لیے فطری طور پر دینی مدارس سے تعلیم پانے والے نوجوان دوسرے شعبوں میں منتقل ہو جائیں گے اور ہمارے ہاں رجال کار کا خلا اسی طرح باقی رہ جائے گا جس کو ختم کرنے کے لیے دینی مدارس کا جداگانہ نظام قائم کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے بزرگوں کا ذہن کس انداز سے سوچتا تھا، اس کا اندازہ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی کی اس روایت سے کر لیجئے جو مولانا مفتی ظفیر الدین مفتاحی نے ''حیات مولانا گیلانی'' میں مولانا مرحوم سے نقل کی ہے۔

وہ فرماتے ہیں کہ ٹونک کے زمانہ قیام میں ٹونک کے نواب کے طبیب خاص مولانا حکیم برکات احمدؒ ان کے استاذ تھے۔ مولانا گیلانی دینی تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں امتیازی ذہانت سے بہرہ ور فرمایا تھا۔ ان کا خیال ہوا کہ استاد محترم سے طب کی تعلیم حاصل کریں تاکہ ذریعہ معاش طب کو بنائیں اور دینی خدمات جتنی ہو سکے، رضا کارانہ طور پر سرانجام دیتے رہیں مگر استاد محترم نے انہیں طب پڑھانے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے حکیم صاحب مرحوم کے بھائی صاحب سے رجوع کیا۔ وہ بھی بڑے طبیب تھے، لیکن مولانا حکیم برکات احمدؒ نے انہیں بھی سختی کے ساتھ مولانا مناظر احسن گیلانی کو طب پڑھانے سے منع کر دیا۔ مولانا گیلانی کے بقول استاد مرحوم نے طب پڑھانے سے خود انکار اور دوسروں کو منع اس لیے کیا کہ ذی استعداد اور ذہین مولوی ہے، استاد بنے گا تو ملک وملت کو عظیم فائدہ ہوگا، طبیب بن کر کیا کرے گا؟ علاج معالجہ کے راستے سے اچھے پیسے کما لے گا، مگر اس کام کے لیے بہت سارے اطبا موجود ہیں۔ اس گوہر گراں مایہ کا برباد ہونا بڑا علمی خسارہ ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے اکابر اپنے ہاں کے ذہین افراد کو دوسرے شعبوں میں منتقل ہونے سے عملاً روکتے تھے اور یہ ان کی حکمت عملی کا حصہ تھا کہ دینی تعلیم حاصل کرنے والے ذہین افراد اسی شعبہ میں رہیں اور ایثار وقربانی سے کام لیتے ہوئے مراعات اور سہولتوں کے فقدان کے باوجود دین کی خدمت کو ترجیح دیں۔

اس کے ساتھ ہی اسی کتاب سے مولانا مناظر احسن گیلانی کی ایک اور روایت بھی ملاحظہ

کرلیں جس میں وہ بتاتے ہیں کہ جب شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن تحریک آزادی کی قیادت کررہے تھے اوران کے گرد برطانوی حکومت کا ریاستی حصار تنگ ہوتا جارہا تھا، حضرت شیخ الہند دارالعلوم دیوبند میں صدر مدرس تھے، اس لیے اس صورت حال سے دارالعلوم دیوبند کے منتظمین کا پریشان ہونا فطری بات تھی اور ممکنہ خطرات وخدشات سے دارالعلوم کو بچانے کی سعی ان کی ذمہ داری بھی تھی۔ مولانا مناظر احسن گیلانی ان دنوں شیخ الہند کے قریبی حلقے میں تھے۔ دارالعلوم کے نائب مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نے مولانا مناظر احسن گیلانی کو اپنا نمائندہ بنا کر حضرت شیخ الہند کی خدمت میں یہ دریافت کرنے کے لیے بھیجا کہ اس معاملہ میں وہ کہاں تک آگے جانا چاہتے ہیں اور ممکنہ خطرات سے دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی نظام وماحول کو بچانے کی کیا صورت ہوگی؟ مولانا گیلانی کے بقول حضرت شیخ الہند نے فرمایا کہ ان کے نزدیک دارالعلوم دیوبند کے قیام کا مقصد ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کی ناکامی کی تلافی کی کوشش کرنا تھا، اس لیے تعلیم وتعلم اور درس وتدریس جن کا مقصد اور نصب العین ہے، میں ان کی راہ میں مزاحم نہیں ہوں، لیکن خود اپنے لیے اسی راہ کا انتخاب کیا ہے جس کے لیے یہ نظام میرے نزدیک حضرت الاستاذ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے قائم کیا تھا۔ فرائض الٰہیہ جس حد تک بن پڑا، ادا کرتا رہا۔ اب آخری کام رہ گیا ہے جسے آخری حد تک کرگزروں گا۔ چنانچہ اس کے ڈیڑھ دو برس بعد حضرت شیخ الہند تحریک ریشمی رومال کے سلسلے میں حجاز مقدس گئے اور انقلابی تحریک کا راز فاش ہو جانے کی بنا پر گرفتار کرکے مالٹا جزیرے میں پہنچا دیے گئے۔

اس کا مطلب واضح ہے کہ دینی مدارس کے جداگانہ نصاب ونظام سے ہمارے اکابر کا اصل ہدف صرف تعلیم نہیں تھا اور نہ ہی وہ ''تعلیم برائے تعلیم'' کے فلسفہ کے قائل تھے بلکہ وہ ملی مقاصد کے حصول کے لیے اس نظام ونصاب کو ذریعہ بنائے ہوئے تھے، اس لیے اگرچہ دینی مدارس کے تعلیمی ماحول کو قائم رکھنا اور ہر دور میں اس نظام ونصاب کو خطرات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرنا اس نظام کے بنیادی تقاضوں میں سے ہے اور دینی مدارس کے ارباب اختیار وانتظام کی ذمہ داری ہے، لیکن دینی مدارس، اس کے نظام ونصاب اور ماحول کو ملی مقاصد وضروریات سے الگ نہیں کیا

جاسکتا اور دینی مدارس کے قیام کا اصل مقصد اور اہداف یہی ہے کہ امت مسلمہ کی فکری و علمی قیادت کے خلا کو پر کیا جائے اور عالمی کفر و استعمار کے ساتھ عقیدہ و ثقافت کی جنگ میں ملت اسلامیہ کو علمی و عملی رہنمائی ان مدارس سے ملتی رہے۔

اس کے بعد ایک اور پہلو پر بھی نظر ڈال لیجیے جس کا تذکرہ شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے ان الفاظ میں کیا ہے کہ:

''یہ کیا طریقہ ہے کہ پست و بالا، کس و ناکس ہر قسم کے طالب علموں کو دورہ حدیث میں شرکت کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ صرف دو چار ذہین طالب علموں کو ہی پڑھاؤں گا تاکہ کیفاً کچھ ذی استعداد علماء تیار ہوسکیں۔ حضرت تھانویؒ کا نظریہ بھی یہی تھا کہ تعلیم کی اشاعت کماً اور کیفاً دونوں طرح ہونی چاہیے۔ کماً کا طریقہ تو وہی ہے جو ہمارے مدارس میں رائج ہے۔ علماء بڑی تعداد میں تیار ہوں اور ملک و بیرون ملک میں پھیلیں لیکن کیفاً اچھے علماء پیدا کرنے کی صورت اس کے سوا کوئی نہیں کہ ذہین و ذکی اور محنتی طلبہ کو لے کر الگ بیٹھا جائے۔ خود حضرت نانوتویؒ بھی مدرسہ میں بیٹھ کر نہیں پڑھایا کرتے تھے بلکہ چند اچھے طلبہ منتخب کر کے ان کی تعلیم و تربیت پر توجہ فرمایا کرتے تھے۔ حضرت شیخ الہند، مولانا احمد حسن امروہوی اور مولانا فخر الحسن گنگوہی اسی طرح پیدا ہوئے۔'' (بحوالہ ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، رجب ۱۳۷۲ھ)

یعنی ہمارے بزرگوں کی یہ کوشش بھی ہوتی تھی کہ دینی مدارس کے فضلا میں سے چند ذہین افراد کو الگ کر کے ان کی بطور خاص امتیازی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا جائے تاکہ ذہانت کی اعلیٰ سطح کو اسی سطح پر اسلام کی دعوت و تبلیغ، اسلام کے بارے میں پھیلائے جانے والے شکوک و شبہات کے ازالہ اور اسلام کے خلاف عالمی کفر و استعمار کی فکری اور ثقافتی یلغار کے مقابلہ کے لیے استعمال میں لایا جاسکے اور عام مسلمانوں کی طرح جدید تعلیم یافتہ حضرات اور اعلیٰ ذہانت کے حامل افراد کی دینی رہنمائی کے لیے بھی اسی سطح پر رجال کار کی فراہمی کو ممکن بنایا جائے۔ ہمارے ہاں دینی مدارس نے شاید اسی خلا کو پر کرنے کے لیے دو تین شعبوں میں تخصص کے درجات کا اہتمام کیا ہے جو ہمارے روایتی دائرہ کے اندر رہتے ہوئے ان شعبوں کی بعض ضروریات کو تو پورا کرتے ہیں، لیکن

اس اہم ضرورت اور تقاضے کی تکمیل نہیں کرتے جس کا ابھی ہم نے تذکرہ کیا ہے۔اس کے لیے آج کے عالمی ماحول کو سمجھنا ہوگا، اسلام کے خلاف عالمی کفر کی فکری وثقافتی جنگ کے اہداف، طریق کار اور ذرائع ووسائل کا ادراک حاصل کرنا ہوگا اور اس کو سامنے رکھتے ہوئے دینی مدارس کے فضلا میں سے ذہین اور محنتی افراد کا انتخاب کر کے انہیں اس کام کے لیے تیار کرنا ہوگا۔

الغرض آج جبکہ دینی مدارس ایک نئے بحران کی زد میں ہیں، ان کے خلاف عالمی اور قومی سطح پر دباؤ بڑھ رہا ہے اور وہ اپنے نظام ونصاب میں ترجیحات واصلاحات کی طرف پیش رفت کر رہے ہیں تو اس مرحلہ میں ہم یہ گزارش کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ملی مقاصد اور معاشرہ کی دینی ضروریات کو پورا کرنے کے اصل اہداف کو سامنے رکھا جائے اور ان کی روشنی میں عملی پیش رفت کی جائے۔ ہم خود دینی مدارس کے نصاب ونظام میں بہت سی اصلاحات، ترامیم اور اضافوں کے حامی بلکہ داعی ہیں، لیکن ایسی اصلاحات وترامیم جو دینی مدارس کو ان کے اصل اہداف ومقاصد کے اور زیادہ قریب کریں اور ان کے فضلا کی صلاحیتوں، استعداد اور قوت کار میں اس حوالہ سے اضافہ کریں۔ ہمیں اپنی ملی ودینی ضروریات اور مغرب کے اغراض ومقاصد میں فرق کرنا ہوگا اور اس سے ہر وقت چوکنا رہنا ہوگا۔ دینی مدارس کے نظام ونصاب میں ترمیم واصلاح کی تجویز وتحریک دودھاری تلوار ہے جو دونوں طرف چل سکتی ہے۔اس ہتھیار کو مغرب بھی استعمال کرنا چاہتا ہے اور ہم بھی اس کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں، مگر دونوں کے اہداف مختلف بلکہ متضاد ہیں۔ یہ دینی مدارس کے وفاقوں کی قیادت کی ذہانت، تدبر اور معاملہ فہمی کا امتحان ہے اور ہماری دعا ہے کہ اللہ رب العزت ہماری تعلیمی قیادت کو اس سلسلے میں دین وملت کی بہتری کے لیے صحیح فیصلے کرنے کی توفیق سے نوازیں۔آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، ۱۴ ستمبر ۲۰۰۳ء)

دینی مدارس کے بارے میں پانچ سوالات کے جوابات

دینی مدارس کے بارے میں عام طور پر چار پانچ سوالات ذہنوں میں پائے جاتے ہیں اور ورلڈ میڈیا کے منفی پروپیگنڈا کے ساتھ ساتھ قومی سطح پر بھی ان کے بارے میں شکوک وشبہات اور تحفظات کا اظہار کیا جارہا ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان سوالات اور شبہات کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لے لیا جائے۔ سوالات یہ ہیں:

۱۔ دینی مدارس اپنے نصاب میں جدید علوم اور آج کی ضروریات مثلاً سائنس، ریاضی، انگلش زبان اور کمپیوٹر وغیرہ کو شامل کیوں نہیں کررہے اور انہیں اس سلسلہ میں کیا رکاوٹ اور حجاب ہے؟

۲۔ جب ملک کے ہزاروں تعلیمی ادارے حکومتی انتظام کے تحت چل رہے ہیں اور حکومت کے مختلف شعبے ان کا کامیابی کے ساتھ انتظام چلا رہے ہیں تو دینی مدارس کو سرکاری کنٹرول میں آنے سے انکار کیوں ہے اور وہ اپنا جداگانہ نظام اور تشخص قائم رکھنے پر کیوں مصر ہیں؟

۳۔ اگر ورلڈ اسٹیبلشمنٹ یا ریاستی ادارے دینی مدارس کو کنٹرول کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو دینی تعلیم کے جس جداگانہ تشخص کی بات کی جاتی ہے، اس کا مستقبل کیا ہوگا؟ اور دینی حلقے اپنا روایتی کردار کس طرح برقرار رکھ سکیں گے؟

۴۔ دینی مدارس میں دی جانے والی تعلیم کے بارے میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس تعلیم کے حصول کے بعد ملازمت کی کوئی گارنٹی نہیں ہے اور روزگار کے تحفظ کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اس کا حل کیا ہے؟

۵۔ دینی مدارس اپنے خلاف ملکی اور عالمی سطح پر پائی جانے والی مہم کو موجودہ عالمی حالات

میں کس نظر سے دیکھتے ہیں اور موجودہ عالمی تہذیبی کشمکش میں ان کا موقف کیا ہے؟

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے کہ دینی مدارس اپنے نصاب میں انگلش زبان، سائنس، ریاضی اور دیگر جدید ضروری علوم وفنون کو شامل کرنے سے کیوں انکاری ہیں، اس کے جواب میں تین گزارشات پیش خدمت ہیں:

پہلی گزارش یہ ہے کہ دینی مدارس کو جائز حد تک ان علوم وفنون کو اپنے نصاب میں شامل کرنے سے کوئی انکار نہیں ہے۔ اب تک مسئلہ زیادہ تر وسائل کا رہا ہے کہ دینی مدارس کے وسائل محدود ہوتے ہیں اور انہیں تھوڑے وسائل کے ساتھ اپنا کام چلانا پڑتا ہے، لیکن اس کے باوجود دینی مدارس نے انگریزی، ریاضی، سائنس اور کمپیوٹر ٹریننگ وغیرہ کے مضامین کو اپنے نصاب میں بتدریج شامل کرنے کا سلسلہ کچھ عرصہ سے شروع کر رکھا ہے اور دینی مدارس کے تمام وفاق میٹرک کی سطح تک اپنے نصاب میں یہ مضامین شامل کر چکے ہیں۔

دوسری گزارش یہ ہے کہ ان مضامین کو نصاب میں شامل کرنے کی جائز حد دینی مدارس کے ارباب حل وعقد کے نزدیک میٹرک ہے۔ اس کے بعد کے نصاب میں ان مضامین کی شمولیت ضروری نہیں بلکہ بعض حوالوں سے نقصان دہ ہے، اس لیے میٹرک کے بعد کے درجات میں ان مضامین کو شامل نصاب کرنے کے لیے دینی مدارس تیار نہیں ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کے بعد تعلیم کے دائرے تقسیم ہو جاتے ہیں اور ہر دائرہ میں اسی شعبہ کے مضامین کی تعلیم ہوتی ہے، اس میں دوسرے شعبوں کے مضامین کو شامل نہیں کیا جاتا۔ مثلاً لا کالج میں صرف قانون کے مضامین پڑھائے جاتے ہیں اور اس میں سائنس پڑھانے کا مطالبہ نہیں کیا جاتا، انجینئرنگ میں صرف اس سے متعلقہ مضامین کی تعلیم ہوتی ہے اور اس میں قانون پڑھانے کا کوئی تقاضا نہیں ہوتا، اور میڈیکل کالج میں صرف طب سے متعلقہ مضامین شامل نصاب ہوتے ہیں اور اس میں انجینئرنگ کے مضامین کی تعلیم کو ضروری خیال نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح دینی تعلیم بھی ایک مستقل شعبہ ہے اور بنیادی تعلیم کی حد میٹرک ہو یا ایف اے، اس کے بعد دینی علوم کے نصاب میں دیگر شعبوں کے مضامین شامل کرنے کا مطالبہ بھی ہمارے نزدیک ایسا ہی ہے جیسے لا کالج میں سائنس

پڑھانے کا مطالبہ کیا جائے یا میڈیکل کالج میں قانون پڑھانے کا تقاضا کیا جائے۔

اس سوال کے جواب میں تیسری گزارش ذرا تلخ سی ہے لیکن اس موقع پر ضروری معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ ہمارے محترم گورنر پنجاب جنرل (ر) خالد مقبول گزشتہ دنوں جامعہ اشرفیہ لاہور میں تشریف لے گئے اور اساتذہ وطلبہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم سائنس اور ٹیکنالوجی میں دوسری قوموں سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں جس کی وجہ سے ہم معاصر اقوام کے سامنے ذلیل ہو رہے ہیں، اس لیے دینی مدارس کو سائنس اور ٹیکنالوجی کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ اس کے جواب میں راقم الحروف نے ایک مضمون میں تفصیل کے ساتھ گزارش کی کہ ان کے اس ارشاد سے مجھے سو فیصد اتفاق ہے کہ ہم سائنس اور ٹیکنالوجی میں معاصر قوتوں سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں اور اسی کی مسلسل مار کھا رہے ہیں، لیکن اس کا ذمہ دار دینی مدارس کو قرار دینے اور ان سے سائنس اور ٹیکنالوجی کی طرف توجہ دینے کے تقاضے سے مجھے اتفاق نہیں ہے۔

یہ بات بالکل درست ہے کہ ہم سائنس اور ٹیکنالوجی میں معاصر قوتوں سے بہت زیادہ پیچھے رہ گئے ہیں اور اس کا احساس ہمیں زیادہ ہے جو مسلمانوں کے عقیدہ وثقافت کے تحفظ کی جنگ میں مغرب کے مقابلہ میں عملی طور پر صف آرا ہیں اور صرف ایک مثال سے اس صورت حال کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ آج سے ایک صدی قبل اللہ تعالیٰ نے ہمارے زوال وادبار کے دور میں ہمیں خلیج عرب میں تیل کے چشموں کی عظیم دولت سے نوازا تھا مگر ہماری نااہلی کی صورت حال یہ تھی کہ ہم زمین کھود کر تیل نکالنے کی صلاحیت سے محروم تھے، تیل نکال کر اسے ریفائن کرنے کی اہلیت ہم میں نہیں تھی اور ریفائن کرنے کے بعد اسے دنیا میں بیچنے یعنی مارکیٹنگ کی صلاحیت سے بھی ہم بے بہرہ تھے، مگر ہم نے اپنی اس نااہلی کو دور کرنے اور ان چیزوں کی صلاحیت حاصل کرنے کے بجائے اس کام کے لیے مغربی ماہرین کو بلایا۔ ماہرین آئے، ان کے بعد مغرب کی کمپنیاں آئیں، پھر دولت سمیٹنے کے لیے مغرب کے بینک آ گئے، ان کے پیچھے کنٹرول حاصل کرنے کے لیے سفارت کاروں اور سیاست کاروں نے چکر لگانا شروع کیے اور آخر میں مغربی ممالک کی فوجیں آئیں جو تیل کے چشموں کا گھیرا ڈالے بیٹھی ہیں۔

زمین ہماری ہے، چشمے ہمارے ہیں، اور تیل بھی ہمارا ہے، لیکن کنٹرول مغربی کمپنیوں کا ہے اور تیل سے حاصل ہونے والی دولت مغربی بینکوں میں ہے جو ہماری نااہلی اور سائنس اور ٹیکنالوجی کی طرف توجہ نہ دینے کا نتیجہ ہے اور ستم بالائے ستم یہ کہ ہم آج بھی پون صدی گزر جانے کے باوجود ان تینوں صلاحیتوں سے کورے ہیں، جبکہ ابھی چند روز قبل امریکی وزارت دفاع پینٹاگون میں دی جانے والی ایک بریفنگ میں واضح طور پر کہہ دیا گیا ہے کہ اگر سعودی عرب نے امریکی ہدایات واحکام پر پوری طرح عمل نہ کیا تو تیل کے چشموں پر براہ راست قبضہ کیا جا سکتا ہے اور مغربی ملکوں میں سعودی عرب کے اثاثے ضبط اور مغربی ملکوں میں اس کے اکاؤنٹس منجمد کیے جا سکتے ہیں۔ اس صورت حال کا دکھ اور تکلیف ہم دینی حلقوں سے زیادہ کس کو ہو سکتا ہے؟ لیکن اس بات کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں مسلمانوں کے دوسری قوتوں سے پیچھے رہ جانے کی ذمہ داری کس پر ہے؟ اور اس میں دینی مدارس کا قصور کیا ہے؟

۱۸۵۷ء میں دہلی پر تاج برطانیہ کی حکومت قائم ہو جانے کے بعد جب متحدہ ہندوستان میں ہمارے صدیوں سے چلے آنے والے نظام تعلیم کو کلیتاً ختم کر دیا گیا اور تمام تر تعلیمی اور تہذیبی نظام کو تلپٹ کر کے رکھ دیا گیا تو اس وقت تعلیمی محاذ پر دو طبقے سامنے آئے۔ ایک علمائے کرام کا گروہ تھا جس نے مسجد و مدرسہ کو آباد رکھنے، قرآن وسنت کی تعلیم کا سلسلہ باقی رکھنے، مسلمانوں کے عقیدہ و اعمال کے تحفظ اور اسلامی تہذیب وثقافت کا تسلسل جاری رکھنے کی ذمہ داری قبول کی اور اس کے لیے کسی قسم کے ریاستی وسائل اور حکومتی تعاون سے بے نیازی اختیار کرتے ہوئے عام مسلمانوں کے رضا کارانہ تعاون سے دینی مدارس کے آزادانہ نظام کی بنیاد رکھی، جبکہ دوسری طرف انگریزی زبان اور سائنس وٹیکنالوجی جیسے جدید علوم کی ترویج وتعلیم کے لیے ایک دوسرا طبقہ سامنے آیا جس نے سائنس، ٹیکنالوجی اور دیگر علوم میں مسلمانوں کو دوسری اقوام کے برابر لانے کی ذمہ داری قبول کی اور ایک مستقل نظام تعلیم کی بنیاد رکھی۔ اگرچہ اس نظام کا آغاز بھی رضا کارانہ چندہ سے ہوا تھا، لیکن اسے بتدریج ریاستی وسائل اور حکومتی تعاون حاصل ہوتا چلا گیا اور بہت جلد ریاست وحکومت نے اس نظام کی تمام تر ذمہ داری اور اخراجات اپنے کھاتے میں ڈال لیے۔

دینی مدارس نے اپنا نظام عام مسلمانوں کے چندہ سے چلایا اور کسی حکومت سے نہ مالی امداد طلب کی اور نہ ہی کسی حکومت کی مالی مدد اس درجہ میں قبول کی کہ اس پر مدارس کے نظام کا انحصار ہو۔ علمائے کرام نے اپنی عزت نفس کی پروا نہ کرتے ہوئے زکوٰۃ مانگی، صدقات مانگے، خیرات مانگی، عطیات مانگے حتیٰ کہ ایک ایک دروازے پر دستک دے کر روٹیاں مانگیں۔ میں نے خود طالب علمی کے دور میں گوجرانوالہ کے مختلف محلوں میں سر پر چھابہ رکھ کر گھروں سے روٹیاں مانگی ہیں۔ ہم چند طالب علم گھروں کے دروازے کھٹکھٹا کر روٹیاں مانگ کر لاتے تھے اور مدرسہ نصرۃ العلوم کے سب طلبہ وہ روٹیاں کھا کر تعلیم حاصل کیا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ برصغیر کے طول وعرض کے اکثر مدارس میں ایک عرصہ تک جاری رہا اور اس طریقہ سے دینی مدارس نے نہ صرف عام مسلمانوں تک قرآن وحدیث کی تعلیم کو پہنچایا ہے بلکہ ان کی مسجدوں اور مدرسوں کو آباد رکھا ہے، ملک بھر کی لاکھوں مساجد میں نماز پڑھانے والے امام مہیا کیے ہیں، قرآن کریم کی تعلیم دینے والے اور رمضان المبارک میں تراویح میں قرآن کریم سنانے والے لاکھوں حافظ اور قاری فراہم کیے ہیں، دینی علوم کی تعلیم دینے والے لاکھوں مدرسین تیار کیے ہیں، مسائل بتانے والے ہزاروں مفتی پیدا کیے ہیں، خطبات دینے والے خطیب مقرر اور واعظ تیار کیے ہیں، کتابیں لکھنے والے مصنفین دیے ہیں، دنیا بھر میں دین اسلام کی دعوت دینے والے لاکھوں مبلغین بھیجے ہیں اور اس سب سے بڑھ کر میدان جنگ میں کفر وظلم کے خلاف ہتھیار اٹھا کر جنگ کرنے والے ہزاروں مجاہدین بھی ان مدارس نے فراہم کیے ہیں، اس لیے اپنی ذمہ داری اور مشن کے حوالے سے دینی مدارس پر کوتاہی کا کوئی الزام عاید نہیں کیا جا سکتا۔

اگر ملک کے کسی حصے میں نماز پڑھانے کے لیے امام میسر نہیں ہے، جمعہ پڑھانے کے لیے خطیب نہیں مل رہا، قرآن کریم پڑھانے والا قاری اور رمضان المبارک میں قرآن کریم سنانے کے لیے حافظ موجود نہیں ہے، دینی علوم کی تعلیم وتدریس کے لیے مدرسین کی کمی ہے، مسئلہ بتانے والے مفتی حضرات کا فقدان ہے یا دین کی دعوت دینے والے مبلغ کی آواز نہیں پہنچ رہی تو اس کے لیے دینی مدارس کو مورد الزام ٹھہرایا جا سکتا ہے اور ان کی کوتاہی شمار کیا جا سکتا ہے، لیکن سائنس اور

ٹیکنالوجی میں دوسری قوموں سے مسلمانوں کے پیچھے رہ جانے کی ذمہ داری دینی مدارس پر ڈالنا انصاف کی بات نہیں ہے۔ اس کے بارے میں ان لوگوں سے دریافت کیجیے جنہوں نے مسلمانوں کو جدید علوم سے بہرہ ور کرنے کی ذمہ داری قبول کی تھی، سائنس اور ٹیکنالوجی میں مسلمانوں کو دوسری قوموں کے برابر لانے کا عہد کیا تھا، اس کے لیے کم از کم ایک صدی سے انہیں ریاستی وسائل میسر چلے آ رہے ہیں اور قومی بجٹ کا ایک بڑا حصہ ان کے لیے وقف ہوتا ہے۔ ان سے پوچھیے کہ وہ قوم کو سائنس اور ٹیکنالوجی میں دوسری قوموں کے برابر لانے میں کیوں کامیاب نہیں ہوئے؟ بلکہ میری گزارش ہے کہ اس مقصد کے لیے قومی تعلیمی کمیشن قائم کیا جائے جو اس بات کا جائزہ لے کہ ریاستی نظام تعلیم ملی اور قومی مقاصد کے حصول میں کیوں ناکام رہا ہے؟ اس کی ذمہ داری کا تعین کیا جائے اور اس عظیم ناکامی کی تلافی کے لیے اقدامات وتجاویز طے کی جائیں۔ چنانچہ میں نے گورنر پنجاب سے اپنے مضمون میں گزارش کی ہے کہ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں قوم کے پیچھے رہ جانے کا رونا ضرور روئیں اور ان علوم کی طرف توجہ کی تلقین بھی ضرور کریں لیکن اس شکوہ اور تلقین کی جگہ جامعہ اشرفیہ نہیں بلکہ پنجاب یونیورسٹی ہے۔ وہاں کھڑے ہو کر یہ گلے شکوے دھرائیں اور اپنی ناکامی کی سیاہی غریب مولوی کے چہرے پر ملنے کی کوشش نہ کریں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ جب ملک کے دیگر ہزاروں تعلیمی ادارے حکومتی کنٹرول میں چل رہے ہیں تو دینی مدارس کو سرکاری نظام وکنٹرول کے دائرہ میں آنے سے کیوں انکار ہے؟ اس کے جواب میں دو باتیں عرض کی جا رہی ہیں۔ ایک تو اصولی بات ہے اور دوسری واقعاتی۔

اصولی بات یہ ہے کہ تعلیم صرف ایک پیشہ ورانہ کام نہیں بلکہ مشن ہے جس کے کچھ اہداف ہوتے ہیں اور جس کا کوئی مقصد ہوتا ہے۔ دونوں کے درمیان مشرق اور مغرب جیسی دوری ہے اور دونوں کا ہدف اور ٹارگٹ ایک دوسرے سے الگ بلکہ ایک دوسرے سے متضاد ہے، اس لیے دینی مدارس کے نظام کو ریاستی نظام کے تابع کرنے کا مطلب اس ہدف، مشن اور مقصد سے دست برداری ہوگا جس کے لیے دینی مدارس کا قیام عمل میں لایا گیا تھا۔ اگر ریاستی نظام تعلیم اپنا قبلہ درست کر لے جو ایک نظریاتی اسلامی ریاست اور حکومت قائم ہونے کے بعد ہی ممکن ہے تو ایک

خالص اسلامی نظریاتی ریاست وحکومت کے نظام کی بالادستی قبول کرنے سے دینی مدارس کو قطعی طور پر کوئی انکار نہیں ہوسکتا، لیکن سیکولر اہداف رکھنے والے ریاستی نظام کے کنٹرول کو قبول کرنا دینی مدارس کے لیے اپنے بنیادی مشن اور ہدف سے محروم ہوجانا ہوگا، اس لیے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

دوسری بات واقعاتی ہے جو اس اصولی گزارش کی عملی تصدیق کرتی ہے کہ بعض دینی مدارس کو سرکاری نظام کے تحت چلانے کا تجربہ ہم اس سے قبل کر چکے ہیں جو ناکام ثابت ہوا ہے۔ صدر ایوب خان مرحوم کے دور میں محکمہ اوقاف قائم ہوا تھا جس نے ملک بھر میں ہزاروں مساجد، مزارات، اوران کے ساتھ بیسیوں مدارس کو تحویل میں لے لیا تھا اور یہ کہا تھا کہ ان کا نظام صحیح نہیں ہے اوران کی مالیات میں گڑبڑ ہوتی ہے، اس لیے انہیں سرکاری تحویل میں لیا گیا ہے تاکہ ان کے نظام کو زیادہ بہتر طریقہ سے چلایا جائے، لیکن عملاً یہ ہوا کہ نظام پہلے سے بھی خراب ہوگیا جس کا مشاہدہ محکمہ اوقاف کے زیر انتظام مساجد اور عام مسلمانوں کی آزادانہ کمیٹیوں کے تحت قائم مساجد کے نظاموں کا کسی بھی شعبہ میں تقابل کر کے کیا جا سکتا ہے، جبکہ محکمہ اوقاف نے کتنے ہی دینی مدارس بھی اس وقت تحویل میں لیے جن کا وجود تک باقی نہیں رہا اور اس کی ایک واضح مثال اوکاڑہ کے گول چوک کی جامع مسجد میں قائم جامعہ عثمانیہ کی شکل میں موجود ہے جس کا مشاہدہ کوئی بھی شخص کسی بھی وقت جا کر کرسکتا ہے۔ محکمہ اوقاف کی تحویل میں جانے سے قبل یہ مدرسہ ملک کے اہم مدارس میں شمار ہوتا تھا اور اس میں سینکڑوں طلبہ ہاسٹل میں رہتے تھے مگر اب وہاں کوئی درس گاہ نہیں ہے، جبکہ مدرسہ کے کمرے محکمہ اوقاف نے مختلف لوگوں کو کرائے پر دے رکھے ہیں۔

صدر محمد ایوب خان مرحوم ہی کے دور میں ریاست بہاولپور باقاعدہ طور پر پاکستان میں ضم ہوئی تو وہاں کا سب سے بڑا دینی مدرسہ جامعہ عباسیہ تھا جسے محکمہ تعلیم نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ اسے اسلامی یونیورسٹی کا درجہ دیا گیا، دینی نصاب تعلیم اور سرکاری نصاب کو ملا کر ایک مشترکہ نصاب تعلیم مرتب کیا گیا، علامہ شمس الحق افغانی، مولانا سید احمد سعید کاظمی اور مولانا عبدالرشید نعمانی جیسے بہت سے علمائے کرام کو مختلف حصوں سے اٹھا کر بہاولپور میں بٹھایا گیا، اور ایک ماڈل دارالعلوم یا

ماڈل اسلامی یونیورسٹی کا اعلان کیا گیا، لیکن آج اس کی حالت یہ ہے کہ دینی نصاب تعلیم کے مضامین اس کے نصاب سے بتدریج خارج ہو چکے ہیں اور اس کا نصاب اب وہی ہے جو ملک کی دیگر سرکاری یونیورسٹیوں کا ہے جبکہ اس کے معیار کا حال یہ ہے کہ جس طالب علم کو ملک کی کسی اور یونیورسٹی میں داخلہ نہیں ملتا، اس کے لیے اسلامی یونیورسٹی بہاولپور کے دروازے کھلے رہتے ہیں۔

محکمہ تعلیم اور محکمہ اوقاف دونوں کے ہاتھوں مختلف دینی مدارس کا یہ حشر دیکھنے کے بعد اگر دینی مدارس سے یہ توقع رکھی جا رہی ہے کہ وہ سرکاری کنٹرول کو قبول کر لیں گے اور محکمہ تعلیم یا محکمہ اوقاف کے نظام میں شامل ہونے کے بعد ان کی حالت پہلے سے بہتر ہو گی تو اسے سادگی اور بھولپن کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ اس لیے بڑے ادب سے گزارش ہے کہ ہم ماضی قریب میں ماڈل دارالعلوم اور سرکاری نظام کا تلخ تجربہ کر چکے ہیں اور اس تجربہ کو دہرانے کے لیے تیار نہیں ہیں کیونکہ مومن کا وصف یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ایک سوراخ سے دو بار نہیں ڈسا جاتا۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ جیسا کہ ورلڈ اسٹیبلشمنٹ اس بات پر تلی بیٹھی ہے اور ریاستی ادارے بھی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں کہ دینی مدارس کو اجتماعی دھارے میں شامل کرنے کے سنہرے عنوان اور انہیں جدید وسائل اور سہولتیں فراہم کرنے کی خوشنما ترغیب کے ساتھ سرکاری کنٹرول میں لایا جائے تو اگر خدانخواستہ یہ عناصر اس میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو پھر آزادانہ دینی تعلیم کا مستقبل کیا ہوگا؟ اس کے جواب میں گزارش ہے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں، کیونکہ طاقت کا استعمال اور چیز ہے اور فکر و عقیدہ کو تبدیل کرنا اس سے بالکل مختلف بات ہے۔ آج کی عالمی اسٹیبلشمنٹ اور اس کا لیڈر امریکہ طاقت اور جبر و تشدد کے ذریعہ جسموں کو ختم کر سکتا ہے۔ وہ ''ڈیزی کٹر'' کی بارش کر سکتا ہے، انسانی جسموں کے پرخچے اڑا سکتا ہے اور بلڈنگوں اور آبادیوں کو تہس نہس کر سکتا ہے، لیکن کسی کے ذہن و عقیدہ کو تبدیل کرنا اس کے لیے ممکن نہیں ہے۔

گزشتہ دنوں امریکہ کے وزیر خارجہ کولن پاول پاکستان تشریف لائے۔ آنے سے قبل ایک انٹرویو میں انہوں نے کہا کہ وہ پاکستانی معاشرے کو سیکولر بنانے کے ایجنڈے پر بھی بات کریں گے۔ ایک مضمون میں راقم الحروف نے ان سے گزارش کی کہ وہ اس پر اپنا وقت ضائع نہ کریں۔

ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔ان سے قبل اب سے دوصدیاں پہلے برطانیہ بھی اسی ایجنڈے پر جنوبی ایشیا میں آیا تھا۔ اس نے ہزاروں دینی مدارس بند کر دیے تھے، ان کی جائیدادیں ضبط کر لی تھیں، بلڈنگیں قبضے میں لے لی تھیں، بہت سی عمارات بلڈوز کر دی تھیں، ہزاروں علمائے کرام کو شہید کر دیا تھا اور ہزاروں کو جیلوں میں ڈال دیا تھا۔ ۱۷۵۷ء میں سراج الدولہ کی شہادت کے بعد ۱۹۴۷ء تک ایک سو نوے برس برطانیہ یہاں اسی ایجنڈے پر کام کرتا رہا، لیکن آج نتیجہ سب کے سامنے ہے کہ مدارس کی تعداد پہلے سے زیادہ ہے، مولوی، حافظ، قاری، خطیب، مدرس، مبلغ اور مجاہد اپنی تعداد اور کارکردگی دونوں حوالوں سے پہلے سے بہتر پوزیشن میں ہیں، اس لیے کسی بھی طاقت ور کو یہ غلط فہمی ذہن سے نکال دینی چاہیے کہ وہ طاقت اور جبر کے ذریعے سے دینی تعلیم کو ختم کر سکتا ہے اور بلڈنگوں پر قبضہ کر کے، علمائے کرام کو گرفتار کر کے یا ان کے ایک حصے کو ملازمتوں اور سہولتوں کے نام پر جال میں پھانس کر دینی تعلیم اور اس کے آزادانہ کردار کو ختم کیا جا سکتا ہے۔

پھر یہ بات بطور خاص قابل توجہ ہے کہ دینی مدرسہ بلڈنگ یا زمین کا نام نہیں ہے بلکہ مولوی اور سوسائٹی کے تعلق کا نام ہے۔ یہ تعلق اگر قائم ہے تو دینی مدرسہ بھی قائم ہے، اسے دنیا کی کوئی طاقت ختم نہیں کر سکتی۔ میں اس پر ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ ہمارے معاشرے میں مولوی اور سوسائٹی کا تعلق قائم ہے۔ یہ تعلق لین کا بھی ہے اور دین کا بھی ہے۔ دین کا تعلق یہ ہے کہ ہمارے معاشرہ میں کسی شخص کو اگر نماز پڑھتے ہوئے کسی بات پر شک ہو گیا ہے کہ نماز خراب تو نہیں ہو گئی تو اس کا یہ شک مولوی نے ہی دور کرنا ہے۔ یہ شک عام مسلمان کو ہوا ہے، پارلیمنٹ کے ممبر کو ہوا ہے، ہائی کورٹ کے جسٹس کو ہوا ہے، پولیس کے آئی جی کو ہوا ہے یا اسٹیٹ بینک کے گورنر کو ہوا ہے، معاشرے کے کسی طبقہ کے کسی بھی شخص کو نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج یا کسی دینی معاملہ میں اگر شک ہو گیا ہے تو اس کا شک بہر حال کسی مولوی سے پوچھ کر ہی دور ہو گا، اس کے سوا اس کی تسلی کی اور کوئی صورت نہیں، حتیٰ کہ اگر کوئی صاحب سارا دن دفتر یا دکان میں کرسی پر بیٹھ کر مولوی کو برا بھلا کہتے رہے ہیں، مولوی کے عیوب اور ان کی کمزوریاں بیان کرتے رہے ہیں، اور غریب مولوی کو بات بات پر کوستے رہے ہیں مگر شام کو گھر گئے تو کسی بات پر اہلیہ محترمہ سے تو تکار ہو گئی، غصے میں منہ سے

کوئی الٹی سیدھی بات نکل گئی اور شک پڑ گیا کہ اب ہم میاں بیوی بھی رہے یا نہیں تو ان صاحب کا یہ شک بھی کسی مولوی نے ہی دور کرنا ہے، وہ اس شک سے نجات پانے کے لیے کسی تھانے میں نہیں جائیں گے، اور نہ ہی پارلیمنٹ یا ہائی کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے، بلکہ اسی مولوی کے حجرے میں جائیں گے جسے سارا دن بیٹھے کوستے رہے ہیں۔ اس مولوی سے پوچھے بغیر ان کی تسلی نہیں ہوگی۔

یہ تو مولوی کا معاشرہ کے ساتھ دین کا تعلق ہے اور یہ وہ چیز ہے جو مولوی معاشرے کو دیتا ہے دوسرا تعلق لین کا ہے کہ سوسائٹی مولوی کو کیا دیتی ہے؟ کسی گھر میں کوئی مصیبت یا پریشانی آ گئی ہے اور صاحب خانہ نے یہ حدیث مبارکہ سن رکھی ہے کہ صدقہ دینے سے بلائیں ٹلتی ہیں اور پریشانیاں دور ہوتی ہیں، ان صاحب نے صدقہ دینے کا ارادہ کیا ہے اور شہر کی بکرا منڈی میں گئے ہیں، وہاں سے انھوں نے صدقہ دینے کے لیے بکرا خریدا اور اس کی رسی پکڑے آ رہے ہیں، کیا خیال ہے وہ یہ بکرا کسی تھانے میں پہنچائیں گے؟ پارلیمنٹ میں لے جائیں گے؟ ہائیکورٹ کے دروازے پر باندھیں گے؟ یا سیکرٹریٹ کے کسی افسر کی نذر کریں گے؟ نہیں، بلکہ وہ کسی مسجد یا مدرسہ کا رخ کریں گے جہاں کوئی مولوی صاحب دس بارہ طلبہ کو پڑھا رہے ہوں اور بکرا ان کے سپرد کر کے ہی انہیں اطمینان ہوگا کہ ان کا صدقہ صحیح جگہ پہنچ گیا ہے۔ یہ بکرا مولوی کا حق ہے اور مولوی نے ہی کھانا ہے، اس لیے میں عرض کیا کرتا ہوں کہ اس معاشرے میں دین کا مسئلہ صرف مولوی نے بتانا ہے اور صدقے کا بکرا مولوی نے ہی کھانا ہے، اس لیے جب تک مولوی اور سوسائٹی کا یہ دوطرفہ تعلق قائم ہے، ورلڈ اسٹیبلشمنٹ اور اس کا لیڈر امریکہ الٹے لٹک جائیں، دینی مدرسہ ہمارے معاشرہ میں بند نہیں ہو سکتا۔

چوتھا سوال یہ ہے کہ دینی مدارس میں دی جانے والی تعلیم پر روزگار کا تحفظ اور ملازمت کی گارنٹی موجود نہیں ہے اور دینی تعلیم حاصل کرنے کے لیے جو نوجوان خود کو وقف کرتا ہے، اس کے بارے میں عام طور پر یہ سوال ہوتا ہے کہ یہ کرے گا کیا؟ اور مولوی تو بن جائے گا لیکن کھائے گا کہاں سے؟ اس کے جواب میں دو باتیں عرض کرنا چاہوں گا۔ ایک یہ کہ ایسا کہنے والوں سے میرا

سوال ہے کہ کیا آج تک کسی مولوی یا حافظ کو انہوں نے بھوکا مرتے دیکھا ہے؟ کسی مولوی، حافظ یا قاری کو بھوک اور فاقے کی وجہ سے خودکشی کرتے دیکھا ہے؟ یا پاکستان کی پوری تاریخ میں مولویوں، قاریوں، یا حافظوں کا کوئی جلوس سڑک پر آیا ہے کہ ان کا گزارا نہیں ہوتا، ان کی تنخواہیں بڑھائی جائیں اور انہیں سہولتیں فراہم کی جائیں؟ کبھی مولوی یا قاریوں نے ہڑتال کی ہو کہ وہ تنخواہیں نہ بڑھانے کی وجہ سے نماز پڑھانے سے انکار کر رہے ہیں یا نماز پڑھانے کے لیے تیار نہیں ہیں؟ اکا دکا شخصی واقعات سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن مجموعی طور پر طبقاتی حیثیت سے دینی حلقوں میں کبھی اس حوالے سے ہڑتال، جلوس، قرارداد یا مطالبات کی فضا دیکھنے میں نہیں آئی ہے۔ میرے ان سوالات کا مطلب یہ ہے کہ جب مولوی خود اپنے افلاس، فقر اور محتاجی کا ڈھنڈورا نہیں پیٹ رہا تو کسی دوسرے کو اس کے لیے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟

دوسری گزارش ہے کہ اس صورت حال کی وجہ کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ دین کی برکت سے مولوی بلکہ دین اور مسجد سے تعلق رکھنے والے ہر شخص کو ضروریات کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور مل جاتا ہے اور یہ عملی تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم سے تعلق رکھنے والا کوئی شخص بحمد اللہ تعالیٰ بھوکا نہیں مرتا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مولوی اور حافظ کو صرف تعلیم نہیں دی جاتی بلکہ اس بات کی ذہنی تربیت بھی دی جاتی ہے کہ نماز پڑھانا اور قرآن کریم کی تعلیم دینا اس کا پیشہ نہیں بلکہ مشن اور دینی خدمت ہے، اس لیے وہ قناعت کرتا ہے، ضروریات کو ضروریات تک محدود رکھتا ہے اور اتنے تھوڑے وظیفہ پر کام کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے بلکہ عملاً کر کے دکھا دیتا ہے جتنے وظیفہ میں کسی دوسرے شعبہ کا کوئی فرد اتنا کام کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ اگر آپ نے مشاہدہ کرنا ہو تو اپنے قریب ہی کسی مسجد کے امام یا کسی مدرسہ کے مدرس سے اس کی تنخواہ اور سہولتوں کے بارے میں پوچھ لیں اور اس کی ڈیوٹی کی نوعیت اور اوقات کار کے بارے میں بھی دریافت کر لیں، آپ کے چودہ طبق روشن ہو جائیں گے اور آپ کو صحیح طور پر اندازہ ہوگا کہ غریب مولوی طعنہ، تحقیر اور تذلیل کے ہر وار کو برداشت کرتے ہوئے کتنے معمولی وسائل کے ساتھ معاشرہ کی کتنی بڑی خدمت سرانجام دے رہا ہے۔

پانچواں سوال موجودہ عالمی تہذیبی کشمکش کے حوالہ سے دینی مدارس کے موقف اور کردار کے بارے میں ہے اور میں اس پس منظر میں آج کی عالمی اسٹیبلشمنٹ سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ یہ بات درست ہے کہ تمہیں دینی مدرسہ کے کردار اور اس کے وجود سے سخت تکلیف ہے اور تم بجا طور پر یہ سمجھتے ہو کہ دنیا بھر میں انسانی معاشرہ پر مذہب کے اثرات کو ختم یا محدود کر دینے میں گزشتہ دو صدیوں کے درمیان تم نے جو کامیابیاں حاصل کی ہیں اور اسلام کے سوا ہر مذہب کے پیروکاروں کو تم نے مذہب کے اجتماعی کردار سے دست برداری پر آمادہ کر لیا ہے، ان کامیابیوں کے عمل کو اسلامی معاشرہ میں آکر بریک لگ گئی ہے اور تم دنیا کے کسی بھی حصے میں عام مسلمانوں کو دین اسلام کی بنیادوں سے ذہنی طور پر دست بردار کرانے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے۔ آج کی صورت حال یہ ہے کہ مسلمان دین سے عملاً کتنا دور کیوں نہ ہو اور دین کی کسی ایک بات پر بھی اس کا عمل نہ ہو، لیکن اس کی ذہنی کمٹمنٹ قرآن کریم کے ساتھ اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے ساتھ آج بھی بے لچک ہے۔

آپ عملی تجربہ کر کے دیکھ لیجیے۔ دنیا کے کسی بھی حصے میں کسی بھی عام مسلمان سے ہاں یا نہ کے طور پر سوال کیجیے کہ قرآن کریم کا یہ ارشاد ہے اور آج کی عالمی برادری اس کے خلاف یہ تقاضا کر رہی ہے، یا جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ ہے اور اقوام متحدہ کی فلاں قرارداد میں اس کے برعکس یہ تقاضا ہے، اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ اس مسلمان کا اسلام کی کسی بات پر عمل ہو یا نہ ہو، لیکن اس سوال کے جواب میں وہ کوئی توقف کیے بغیر دوٹوک جواب دے گا کہ عالمی برادری اور اقوام متحدہ کا تقاضا غلط ہے اور قرآن کریم اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بالکل صحیح اور بجا ہے۔

قرآن وسنت کے ساتھ عام مسلمان کی یہ بے لچک کمٹمنٹ آج کی ورلڈ اسٹیبلشمنٹ اور عالمی استعمار کے لیے چیلنج بنی ہوئی ہے، حتیٰ کہ امریکہ کے سابق صدر کلنٹن کو ابھی چند ماہ قبل مکہ مکرمہ کے پڑوس جدہ میں اکنامک فورم سے خطاب کرتے ہوئے سعودی حکمرانوں سے کہنا پڑا ہے کہ اگر تم دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ میں ہمارے ساتھ مخلص اور سنجیدہ ہو تو تمہیں اپنے نظام تعلیم

میں تبدیلی کرنا ہوگی اور دینی مواد کم کرنے کے ساتھ ساتھ عقیدہ کی تلقین بھی ختم کرنا ہوگی۔ ہم عالمی استعمار کی اس تکلیف کو سمجھتے ہیں کہ مذہب اور دین کے خلاف اس کی صدیوں کی مہم اسلامی معاشرہ میں آ کر ناکامی سے دوچار ہو رہی ہے جس کی وجہ دینی تعلیم اور دینی درس گاہ ہے اور اسی وجہ سے ورلڈ اسٹیبلشمنٹ اور اس کی ہدایات پر چلنے والی مسلم ریاستیں دینی مدارس کے آزادانہ کردار کو ختم کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہیں، لیکن ورلڈ اسٹیبلشمنٹ سے میرا سوال یہ ہے کہ تم دینی تعلیم کو ختم کرنے کا تجربہ کتنی بار دہراؤ گے؟ گزشتہ دو صدیوں میں تم نے عالمی سطح پر اس کام کے لیے تین تجربے کیے ہیں اور تینوں میں تمھیں ناکامی ہوئی ہے۔

تم نے سب سے پہلا تجربہ جنوبی ایشیا میں کیا جس کا ذکر میں پہلے بھی کر چکا ہوں کہ برطانوی حکومت نے اس خطہ میں ہزاروں دینی مدارس کو بند کیا، جائیدادیں ضبط کیں، عمارات مسمار کیں اور پڑھانے والوں کو ہزاروں کی تعداد میں موت کے گھاٹ اتار دیا لیکن تمام تر جبر کے باوجود دینی تعلیم موجود ہے بلکہ پہلے سے زیادہ ہے۔

تم نے دوسرا تجربہ ترکی میں کیا۔ وہاں خلافت کا خاتمہ کرایا، عربی زبان ختم کرائی، رسم الخط تبدیل کرایا، عدالتوں سے شرعی قوانین ختم کرائے، مدارس بند کرائے، قرآن کریم اور اذان تک کو عربی میں پڑھنا ممنوع قرار دلوایا، شرعی پردہ کو قانوناً ختم کرایا حتیٰ کہ ایک منتخب خاتون رکن پارلیمنٹ کو صرف اسکارف سر پر لینے کی وجہ سے پارلیمنٹ کی رکنیت سے محروم ہونا پڑا، لیکن ان تمام اقدامات اور جبر وتشدد کے باوجود پون صدی گزر جانے کے بعد بھی ترکی کے عام مسلمانوں میں نہ صرف دینی تعلیم موجود ہے بلکہ دینی روایات وشعائر کے ساتھ ساتھ سوسائٹی میں دینی اقدار کے دوبارہ غلبہ کی خواہش بھی پائی جاتی ہے جس پر قابو پانے کے لیے تمہارے پاس فوجی جبر کے سوا کوئی راستہ موجود نہیں اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ترکی کے عوام کو فوجی جبر سے آزاد کر کے آج بھی کھلی فضا میں اپنی حکومت منتخب کرنے کا موقع دیا جائے تو وہی لوگ منتخب ہوں گے جو اسلامی اقدار پر یقین رکھتے ہیں اور سوسائٹی میں اسلام کے اجتماعی کردار کی بحالی کے خواہش مند ہیں، اس لیے ترکی میں بھی تمہارا تجربہ ناکام ثابت ہوا۔

تم نے مسلم معاشرہ کو دینی تعلیم سے محروم کرنے کا تیسرا تجربہ وسطی ایشیا میں کیا جہاں بخارا، تاشقند اور سمرقند جیسے اسلامی تہذیب کے مراکز میں ہزاروں مساجد و مدارس کو جبراً بند کر دیا گیا، مسجدوں اور دینی درسگاہوں کو تالے لگ گئے۔ میں نے تاشقند میں وہ مسجد دیکھی ہے جو چالیس سال تک سیمنٹ کا گودام رہی ہے اور سمرقند کی اس جامع مسجد میں ایک رات گزاری ہے جس کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ اس کا مین ہال نعوذ باللہ نصف صدی تک سینما ہال بنا رہا ہے۔ ہم نے خرتنگ میں امام بخاریؒ کے مزار سے باہر ایک بڑھیا کو قرآن کریم کا نسخہ دیا تو وہ اسے سینے سے لگا کر زار و قطار رونے لگی کہ ستر سال کے بعد قرآن کریم کی زیارت نصیب ہوئی ہے۔ جہاں جبر و تشدد کا یہ ماحول تھا کہ تاشقند کی قوقل تاش مسجد کے امام نے بتایا کہ ہم اگر دو بھائی اپنے گھر کے صحن میں نماز پڑھتے تھے تو ایک بھائی دروازے پر پہرہ دیتا تھا کہ کوئی شخص ہمیں نماز پڑھتے دیکھ نہ لے۔ لیکن پون صدی کے اس خوفناک ریاستی جبر کے باوجود وسطی ایشیا میں دینی تعلیم آج بھی موجود ہے اور میں نے ان ہزاروں خفیہ درسگاہوں میں سے ایک کی زیارت کی ہے جو زیر زمین تہہ خانوں میں قائم تھیں اور جہاں رات کے پچھلے پہر طلبہ خفیہ طور پر آ کر وہی کتابیں اور علوم پڑھتے تھے جو ہمارے دینی مدارس میں رائج ہیں اور جن کی تعلیم حاصل کر کے حافظ، قاری اور عالم دین بنتے ہیں۔ چنانچہ آج صورت حال یہ ہے کہ وسطی ایشیا میں سوویت یونین کے خاتمہ کے بعد مسلم ریاستیں آزاد ہوئی ہیں اور ہزاروں مساجد و مدارس کے تالے کھلے ہیں تو انہیں نماز پڑھانے اور قرآن کریم کی تعلیم دینے کے لیے باہر سے افراد درآمد نہیں کرنا پڑے، بلکہ خفیہ درسگاہوں میں پڑھنے والے ہزاروں طلبہ نے ہی مساجد و مدارس کا نظام سنبھال لیا ہے اور عملاً صرف اتنا فرق پڑا ہے کہ زیر زمین خفیہ تہہ خانوں میں چلنے والے مدارس زمین کے اوپر ان مساجد و مدارس میں واپس آ گئے ہیں جنہیں ساٹھ یا ستر سال کے بعد آزادی نصیب ہوئی ہے۔

اس لیے میں عالمی استعمار اور ورلڈ اسٹیبلشمنٹ سے دوٹوک عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جبر و تشدد کے ایک نئے دور سے بھی تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اس سے ہماری مشکلات میں یقیناً اضافہ ہوگا اور آزمائش کے نئے مراحل ہمارے لیے بلاشبہ صبر آزما ہوں گے، لیکن اس سے دینی تعلیم کے

تسلسل میں کوئی فرق نہیں آئے گا، وہ باقی رہے گی اور قیامت تک باقی رہے گی، اس لیے کہ یہ خدا کا دین ہے اور اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین ہے۔ یہ ہمارے عقیدہ کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو قیامت تک دنیا میں محفوظ رکھنے کا اعلان فرمایا ہے اور وہ کبھی غلط نہیں ہوسکتا۔ ہمارا ایمان ہے کہ جب وہ قرآن کریم اور اس کی تعلیم کی حفاظت کرے گا تو اس کے اسباب کی بھی حفاظت کرے گا۔ ظاہر بات ہے کہ مجھے اگر دودھ کے ایک پیالے کی حفاظت کے لیے کہا جائے گا تو میں صرف دودھ کی حفاظت نہیں کروں گا بلکہ اس پیالے کی حفاظت بھی کروں گا جس میں وہ دودھ ہے، کیونکہ عالم اسباب میں اس پیالے کی حفاظت سے ہی دودھ کی حفاظت بھی ہوگی۔ اس لیے یہ دینی مدارس قرآن کریم کی تعلیم کے اسباب ہیں جن کی حفاظت قرآن کریم کے ساتھ خود بخود ہوتی رہے گی بلکہ یہ تو کشتی نوح کی حیثیت رکھتے ہیں اور فتنوں اور آزمائشوں کے اس ہمہ گیر سیلاب اور طوفان میں وہی شخص نجات حاصل کر سکے گا جو اس کشتی میں سوار ہو جائے گا، اس لیے جہاں میں عام مسلمانوں سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ اپنے ایمان کی حفاظت کے لیے اس کشتی میں آ جائیں، اس کے بغیر وہ ایمان نہیں بچا سکیں گے، اسی طرح ورلڈ اسٹیبلشمنٹ سے بھی میری گزارش ہے کہ وہ حقائق کو تسلیم کرے اور چٹان کے ساتھ ٹکراتے رہنے کے بجائے اس چٹان کا وجود تسلیم کر لے۔

باقی رہی بات انسانی سوسائٹی کے لیے بہتر سسٹم اور نظام کی تو اس سے زیادہ یقین کے ساتھ ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ آج کی ورلڈ اسٹیبلشمنٹ کے بجائے نسل انسانی کے بہتر مستقبل کی ضمانت دینے والا نظام ہمارے پاس ہے۔ عالمی استعمار کے لیڈر چاہیں تو ہم اس پر ان کے ساتھ گفتگو کے لیے تیار ہیں، مگر اس کے لیے انہیں محاذ آرائی ترک کر کے مذاکرات کی میز پر آنا ہوگا اور یہ بہرحال طے ہے۔ آج نہیں تو کل، کیونکہ اس کے بغیر آج کی دنیا کے پاس کوئی متبادل راستہ اور چوائس نہیں۔

(روزنامہ اوصاف، ۱۳ تا ۱۵/ اکتوبر ۲۰۰۲)

پاکستان کے دینی مدارس اور دہشت گردی

لندن کے بم دھماکوں کے بعد عالمی حلقوں میں جو ارتعاش پیدا ہوا ہے، اس نے ایک بار پھر دینی مدارس کو بین الاقوامی میڈیا میں گفتگو کا موضوع بنا دیا ہے اور نہ صرف پاکستان میں متعدد دینی مدارس پر چھاپوں کا سلسلہ از سر نو شروع ہو گیا ہے بلکہ برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیئر کے ایجنڈے میں بھی دینی مدارس اب پہلے نمبر پر نظر آ رہے ہیں۔

لندن کے بم دھماکوں کی دنیا کے ہر باشعور شخص نے مذمت کی ہے کہ اس طرح کسی ملک کے پرامن شہریوں کی جانوں سے کھیلنے کا بہر حال کوئی جواز نہیں ہے۔ وہ لوگ بھی جو خودکش حملوں کو آزادی اور قومی وقار کی جنگ لڑنے والے مجاہدین کے لیے میدان جنگ کا آخری ہتھیار سمجھتے ہیں اور استعماری قوتوں کے خلاف برسر پیکار حریت پسندوں کے لیے بوقت ضرورت اس ہتھیار کے استعمال کو ان کا جائز اور ناگزیر حق تصور کرتے ہیں، ان کے لیے بھی اس قسم کے اقدامات کی حمایت ممکن نہیں ہے، لیکن ان دھماکوں کے بعد جن امور پر بحث ومباحثہ کا عالمی سطح پر از سر نو آغاز ہو گیا ہے، ان میں پاکستان کے دینی مدارس کے کردار اور افادیت کا مسئلہ خصوصی اہمیت حاصل کرتا جا رہا ہے۔

دھماکوں کے فوراً بعد برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیئر نے جس ردعمل کا اظہار کیا تھا، اس میں دنیا کے انصاف پسند حلقوں کے لیے یہ حوصلہ افزا پہلو موجود تھا کہ انہوں نے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں مبینہ دہشت گردی کے اسباب کا جائزہ لینے اور ان کے سدِ باب کی ضرورت پر زور دیا تھا اور یہ کہا تھا کہ صرف سیکیورٹی کے انتظامات ہی دہشت گردی کا حل نہیں ہیں بلکہ یہ

دہشت گردی جن اسباب وعوامل کے نتیجے میں رونما ہوئی ہے،ان کے خاتمے کے لیے بھی اقدامات ضروری ہیں اوراس کے بغیر دہشت گردی پر قابونہیں پایا جاسکتا۔مسٹرٹونی بلیئر کے اس حقیقت پسندانہ طرزعمل پر دنیا کے منصف مزاج لوگوں کو یہ توقع ہونے لگی تھی کہ اب شاید بعض مسلمان حلقوں کی اس مسلح مزاحمتی جدوجہد، جسے دہشت گردی قرار دے کراس کے خلاف امریکا کی قیادت میں جنگ لڑی جارہی ہے، کے اسباب ومحرکات کی نشاندہی اوران کے سدِ باب کے لیے اقدامات کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے لیکن اس کے چندروز بعد برطانوی وزیراعظم نے حکمران لیبر پارٹی کی پالیسی کانفرنس میں جو تفصیلی خطاب کیا ہے،اس نے اس توقع کا گلا گھونٹ دیا ہے اوریوں نظرآتا ہے کہ ٹونی بلیئر امریکی صدر جارج بش سے بھی زیادہ جارحانہ لہجے میں بات کہنے پراتر آئے ہیں، چنانچہ انہوں نے اپنے اس خطاب میں مختلف مسلم ممالک کی مزاحمتی تحریکوں کا ذکر کرتے ہوئے صاف طور پر یہ کہہ دیا ہے کہ وہ ان کی کوئی بات سننے کے لیے تیارنہیں ہیں اور وہ اس مبینہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کو ہر قیمت پر جیتنا چاہتے ہیں۔

مسٹربلیئر نے اس خطاب میں ایک طرف تہذیبوں کے درمیان تصادم کی نفی کی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ اعتراف کیا ہے کہ دہشت گردوں کے خلاف یہ جنگ دراصل ان کے نظریات کے خلاف جنگ ہے اور وہ اس کے ذریعے سے اپنے طرز زندگی کے تحفظ کی جنگ لڑ رہے ہیں۔انہوں نے کہا ہے کہ یہ دہشت گرد اسرائیل کوختم کرنا چاہتے ہیں، عالم اسلام میں خلافت قائم کرنا چاہتے ہیں اور مسلم ممالک میں شرعی قوانین نافذ کرنا چاہتے ہیں جبکہ یہ امور مسٹر ٹونی بلیئر کے نزدیک اس قدر سنگین جرائم ہیں کہ انہوں نے اسے ''بدی کا نظریہ'' قرار دیتے ہوئے اس سلسلے میں گفتگو اور مذاکرات کا امکان بھی مسترد کر دیا ہے۔

برطانوی وزیراعظم نے اس ''بدی کے نظریہ'' کا سرچشمہ پاکستان کے دینی مدارس کو قرار دیا ہے اور ایک بیان میں کہا ہے کہ وہ ان مدارس کے خلاف کارروائی کا بے چینی کے ساتھ انتظار کر رہے ہیں۔دوسری طرف لندن کے دھماکوں کے سلسلے میں جن افراد کو خودکش حملوں کا مرتکب قرار دیا گیا ہے، ان کا پاکستان کے بعض دینی مدارس کے ساتھ تعلق ظاہر کرتے ہوئے ان کے خلاف

کریک ڈاؤن کی تیاری ہو رہی ہے اور ان سطور کی اشاعت تک اس سلسلے میں خاصی پیش رفت ہو چکی ہوگی۔

جہاں تک دینی مدارس کا تعلق ہے، یہ بات ایک سے زائد بار واضح ہو چکی ہے کہ ان پر طلبہ کو دہشت گردی کی تربیت دینے کا الزام قطعی طور پر غلط ہے اور اب تک جتنے چھاپے بھی مختلف مدارس کے خلاف مارے گئے ہیں، کسی ایک مدرسہ میں بھی ایسے آلات یا ماحول نہیں پایا گیا جسے دہشت گردی کی تربیت کے الزام کے لیے بنیاد بنایا جا سکے۔ حکمران مسلم لیگ کے سربراہ اور سابق وزیر داخلہ چودھری شجاعت حسین ابھی چند ہفتے قبل ایک بھرپور کنونشن میں یہ بات کہہ چکے ہیں کہ انہوں نے اپنے دور وزارت میں پورے ملک کے دینی مدارس کی چھان بین کرائی تھی اور ملک بھر میں ایک مدرسہ بھی دہشت گردی کی تربیت میں ملوث نہیں پایا گیا تھا۔ اس کے علاوہ ملک میں دینی مدارس کے سب سے بڑے فورم وفاق المدارس العربیہ پاکستان کی قیادت کئی بار کھلا کھلم کہہ چکی ہے کہ ملک کے کسی ایک مدرسے کی نشاندہی کی جائے جس میں دہشت گردی کی تربیت دی جاتی ہو۔ اگر کوئی مدرسہ ایسا پایا گیا تو وفاق المدارس اس کے خلاف کارروائی میں حکومت کے ساتھ شریک ہوگا مگر اس کے باوجود ان دینی مدارس کے خلاف معاندانہ پروپیگنڈے کا سلسلہ جاری ہے اور نہ صرف عالمی میڈیا بلکہ برطانوی وزیر اعظم بھی دینی مدارس کی کردار کشی کی اس مہم میں شریک ہیں۔

کہا جا رہا ہے کہ لندن میں جن افراد نے خودکش حملے کیے ہیں، انہوں نے کسی دور میں بعض دینی مدارس میں تعلیم پائی ہے۔ اگر یہ بات درست بھی ہو تو کسی درس گاہ میں تعلیم پانے والے کسی شخص کے کسی جرم کا اس درس گاہ کو ذمہ دار ٹھہرانا کس طرح قرین انصاف قرار پا سکتا ہے؟ کیونکہ اگر اسے ایک اصول کے طور پر تسلیم کر لیا جائے تو دنیا بھر میں سنگین ترین جرائم کے مرتکب افراد کے جرائم کی ذمہ داری ان تعلیمی اداروں پر ڈالی جانی چاہیے جن میں انہوں نے کبھی تعلیم حاصل کی تھی۔ اس طرح ہارورڈ، آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیاں بھی اس الزام کا سامنا کرنے پر مجبور ہوں گی کہ ان کے ہاں تعلیم پانے والے بہت سے افراد مختلف ممالک میں بدعنوانیوں، کرپشن، آمریت،

ڈکیٹرشپ، قتل وغارت، ڈکیتی اور دیگر سنگین جرائم میں ملوث ہیں، اس لیے وہ ان جرائم کے بدی کے سرچشمہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان مدارس میں تو اسلحہ کی ٹریننگ نہیں دی جاتی اور ملک میں کسی ایک مدرسہ کی اب تک نشان دہی نہیں کی جاسکی جو اپنے طلبہ کو جدید اسلحہ کی اس انداز سے ٹریننگ دیتا ہو جبکہ ملک کی جیلوں اور عدالتوں کا ریکارڈ چھان کر ایسے سینکڑوں افراد کی نشان دہی کی جاسکتی ہے جنہوں نے پاک فوج کی تربیت گاہوں میں اسلحہ کی ٹریننگ حاصل کی اور پھر ریٹائرمنٹ کے بعد یا فوج سے بھگوڑے ہو کر جرائم پیشہ بن گئے۔ ظاہر بات ہے کہ صرف اتنی بات پر کہ انہوں نے ٹریننگ پاک فوج کے انتظام کے تحت حاصل کی تھی، ان کے جرائم کی ذمہ داری پاک فوج پر نہیں ڈالی جاسکتی۔

دینی مدارس کو اگر اس ''جرم'' کا قصوروار ٹھہرایا جائے تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ وہ اسلامی عقیدے کی تعلیم دیتے ہیں، خلافت کا سبق پڑھاتے ہیں، شرعی قوانین کی تعلیم دیتے ہیں اور زندگی کے ہر شعبے کے بارے میں قرآن وسنت کے احکام وقوانین سکھاتے ہیں، کیونکہ ان دینی مدارس کے وجود کا مقصد ہی یہ ہے اور وہ اسی کے لیے کام کر رہے ہیں۔ اگر مسٹر ٹونی بلیئر کے نزدیک یہ ''جرم'' ہے تو اس جرم کے ارتکاب سے یہ دینی مدارس کسی طرح باز نہیں آسکتے مگر انہیں دہشت گردی کی تربیت کے مراکز قرار دے کر انتقام کا نشانہ بنانا کسی طرح بھی حقیقت پسندانہ طرز عمل قرار نہیں دیا جاسکتا۔

(روزنامہ اسلام، ۲۲ر جولائی ۲۰۰۵ء)

دینی نظام تعلیم: مثبت اور منفی پہلو

پاکستان، بنگلہ دیش اور بھارت کے طول وعرض میں لاکھوں کی تعداد میں پھیلے ہوئے دینی مدارس ومکاتب کا موجودہ نظام ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کی ناکامی کے بعد پیدا ہونے والے حالات کا نتیجہ ہے۔ اس سے قبل پورے برصغیر میں درس نظامی کا یہی نصاب تعلیمی اداروں میں رائج تھا جو مغل بادشاہت کے دور میں اس وقت کی ضروریات اور تقاضوں کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا تھا اور جو اب بھی ہمارے دینی مدارس میں بدستور رائج چلا آرہا ہے۔

فارسی اس دور میں سرکاری زبان تھی اور عدالتوں میں فقہ حنفی رائج تھی، اس لیے درس نظامی کا یہ نصاب اس دور کی دفتری اور عدالتی ضروریات کو پورا کرتا تھا اور دینی تقاضوں کی تکمیل بھی اس سے ہو جاتی تھی، اس لیے اکثر وبیشتر مدارس کا نصاب یہی تھا اور تقریباً تمام مدارس سرکار کے تعاون سے بلکہ سرکار کی بخشی ہوئی زمینوں اور جاگیروں کے باعث تعلیمی خدمات سرانجام دیتے چلے آرہے تھے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کی ناکامی کے بعد دہلی کا اقتدار ایسٹ انڈیا کمپنی سے براہ راست تاج برطانیہ کو منتقل ہوا اور باقاعدہ انگریزی حکومت قائم ہوگئی تو سرکاری زبان فارسی کے بجائے انگریزی کر دی گئی اور عدالتی نظام سے فقہ حنفی کو خارج کر کے برطانوی قوانین نافذ کر دیے گئے جس سے ہماری تعلیمی ضروریات دو حصوں میں منقسم ہوگئیں۔ دفتری اور عدالتی نظام میں شرکت کے لیے انگریزی تعلیم ناگزیر ہوگئی اور دینی وقومی ضروریات کے لیے درس نظامی کے سابقہ نظام کو رکھنا ضروری سمجھا گیا جبکہ مدارس ومکاتب کا سابقہ نظام ختم کر دیا گیا تھا۔ علماء کی

ایک بڑی تعداد جنگ آزادی میں کام آ گئی، باقی ماندہ میں سے ایک کھیپ کالا پانی اور دیگر جیلوں کی نذر ہوگئی اور پیچھے رہ جانے والے لوگ شکست کے اثرات کو سمیٹے ہوئے مستقبل کے بارے میں سوچنے میں مصروف ہوگئے۔ مدارس ومکاتب کے لیے مغل حکمرانوں کی عطا کردہ جاگیریں ضبط کر لی گئیں اور اس طرح ۱۸۵۷ء سے پہلے کا تعلیمی نظام مکمل طور پر تتر بتر ہوکر رہ گیا۔

نئے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے تعلیمی ضروریات کے دو حصوں میں تقسیم ہوجانے کے بعد اہل دانش نے مستقبل کی طرف توجہ دی۔ سرسید احمد خان مرحوم نے ایک محاذ سنبھال لیا اور دفتری وعدالتی نظام میں مسلمانوں کو شریک رکھنے کے لیے انگریزی تعلیم کی ترویج کو اپنا مشن بنالیا، جبکہ دینی وقومی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے دینی تعلیم کا محاذ فطری طور پر علمائے کرام کے حصے میں آیا اور اس سلسلے میں سبقت اور پیش قدمی کا اعزاز مولانا محمد قاسم نانوتوی اور ان کے رفقا کو حاصل ہوا۔ سرسید احمد خان اور ان کے رفقا نے علی گڑھ میں انگریزی تعلیم کے کالج کا آغاز کیا اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے دیوبند میں مدرسہ عربیہ کی بنیاد رکھی۔ اتفاق کی بات ہے کہ سرسید احمد خان اور مولانا محمد قاسم نانوتوی، دونوں ایک ہی استاذ مولانا مملوک علی نانوتوی کے شاگرد تھے اور دونوں نے مختلف سمتوں میں تعلیمی سفر کا آغاز کیا جو آگے چل کر دو مستقل تعلیمی نظاموں کی شکل اختیار کر گئے۔ ابتدا میں سرسید احمد خان مرحوم کے انگریزی کالج اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے مدرسہ عربیہ دونوں کی بنیاد عوامی چندہ پر اور امداد باہمی کے طریق کار پر تھی، لیکن بعد میں کالج اور اسکول کے نظام کو سرکاری سرپرستی حاصل ہوگئی اور رفتہ رفتہ پورا نظام سرکار کی تحویل میں آکر مصارف و اخراجات کے جھنجھٹ سے آزاد ہوگیا، جبکہ دینی مدارس سرکاری سرپرستی سے آزاد رہے جس کی وجہ سے انہیں اپنے اخراجات وضروریات کے لیے ہر دور میں عوامی چندہ پر انحصار کرنا پڑا اور آج بھی یہ صورت حال بدستور قائم ہے۔

دینی مدارس کے اس آزادانہ اور متوازی نظام کے بنیادی مقاصد درج ذیل تھے:

☆ قرآن وسنت، عربی زبان اور دیگر اسلامی علوم کی حفاظت اور مسلم معاشرہ کا ان سے تعلق برقرار رکھنا۔

☆ مساجد و مدارس کے نظام کو قائم رکھنا اور ان کے لیے ائمہ، خطبا اور مدرسین کی فراہمی۔

☆ یورپ کی نظریاتی اور تہذیبی یلغار کو سامنے رکھتے ہوئے اسلامی طرز معاشرت اور عقائد کی حفاظت۔

☆ جدید عقلیت کے پیدا کردہ اعتقادی و نظریاتی فتنوں سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنا۔

☆ ان مقاصد کے حصول کے لیے ضروری تھا کہ یہ مدارس سرکار کے اثر سے آزاد رہیں اور ایسا تعلیمی نصاب و نظام اختیار کریں کہ اس کے تیار کردہ افراد صرف ان کے مقاصد کے خانہ میں فٹ ہوسکیں۔ اس بات کو زیادہ بہتر طور پر واضح کرنے کے لیے ایک واقعہ بیان کرنا مناسب سمجھتا ہوں جو میں نے مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ کے خطیب حضرت مولانا مفتی عبدالواحد صاحب کی زبانی سنا۔ ان کی روایت کے مطابق یہ اس دور کا واقعہ ہے جب دارالعلوم دیوبند کے مہتمم مولانا محمد قاسم نانوتوی کے فرزند مولانا حافظ محمد احمد تھے ا۔س دور میں دارالعلوم کے فارغ التحصیل کچھ نوجوان حیدرآباد دکن کی ریاست میں ملازمتوں میں فائز ہوئے اور کارکردگی اور صلاحیت کے لحاظ سے دوسرے ملازمین سے بہتر ثابت ہوئے۔ مولانا حافظ محمد احمد کے دورۂ حیدرآباد کے موقع پر نظام حیدرآباد نے ایک ملاقات میں ان سے اس بات کا ذکر کیا اور خواہش ظاہر کی کہ اگر دارالعلوم دیوبند کے فضلا ہر سال سارے کے سارے حیدرآباد بھجوا دیے جائیں تو نظام حیدرآباد انہیں ملازمتیں دیں گے اور دارالعلوم کے سالانہ اخراجات کا بار، نظام خود اٹھالیں گے۔ مولانا حافظ محمد احمد نے دیوبند واپسی پر یہ پیش کش دارالعلوم کے صدر مدرس شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے سامنے بیان کی اور ان سے مشورہ طلب کیا۔ مولانا محمود الحسن نے خود کوئی مشورہ دینے کے بجائے حافظ محمد احمد کو دارالعلوم کے سرپرست حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی خدمت میں بھیج دیا جو اس وقت بقید حیات تھے۔ انہوں نے مولانا حافظ محمد احمد سے نظام حیدرآباد کی پیش کش کے بارے میں سن کر جو جواب دیا، وہ حضرت مولانا مفتی عبدالواحد صاحب کے الفاظ میں یوں تھا:

''بھاڑ میں جائے حیدرآباد کی ریاست! ہم اس ریاست کو چلانے کے لیے طلبہ کو نہیں پڑھا رہے۔ ہم تو اس لیے پڑھاتے ہیں کہ مسجدیں اور قرآن کے مکاتب آباد رہیں اور مسلمانوں کو

نمازیں اور قرآن کریم پڑھانے والے ائمہ اور اساتذ ملتے رہیں۔''

یہی وجہ ہے کہ دینی مدارس میں انگریزی تعلیم کا داخلہ بند رہا اور دینی طلبہ کو انگریزی تعلیم حاصل کرنے سے سختی کے ساتھ منع کیا جاتا رہا، کیونکہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے والے افراد لازماً سرکاری ملازمت کو ترجیح دیتے اور دینی مدارس سے فارغ ہونے والوں کی ایک بڑی کھیپ بھی اس طرف منتقل ہو جاتی جس سے دینی مدارس کے قیام کا بنیادی مقصد فوت ہو جاتا۔ چونکہ دینی مدارس کے نظام کا آغاز کرنے والوں کے ذہن میں سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ ایسی کھیپ تیار ہو جو قرآن پاک کے مکاتب کو آباد رکھے، اس لیے حکمت عملی کے تحت عملاً ایسا طریقہ اختیار کیا گیا کہ دینی مدارس کے فارغ التحصیل حضرات مسجد و مدرسہ کے سوا کسی دوسری جگہ نہ کھپ سکیں۔ چنانچہ اس مقصد کے حوالے سے یہ حکمت عملی کامیاب رہی۔ اس کے نتیجے میں برصغیر کے طول وعرض میں دینی مدارس و مکاتب کا جال بچھ گیا اور مساجد میں ائمہ وخطبا کی کھیپ بھی فراہم ہوتی رہی۔

دینی مدارس کے منتظمین نے ان مقاصد کے حصول کے لیے کیا کیا جتن کیے؟ یہ ایک الگ داستان ہے جس کی تفصیلات کی اس مضمون میں گنجائش نہیں ہے، تاہم اس قدر عرض کرنا ضروری ہے کہ انہوں نے سہولتوں کی زندگی ترک کر کے فقر وفاقہ اور تنگی وترشی کی زندگی اختیار کی، لوگوں سے صدقات وخیرات مانگ کر مدارس کو آباد رکھا، بلکہ کچھ عرصہ پہلے تک تو محلّہ کے ایک ایک گھر سے روٹیاں مانگنے کا سلسلہ بھی قائم رہا، اس لیے یہ بات بے جھجک کہی جا سکتی ہے کہ علماء کے اس طبقہ نے اپنی ''عزت نفس'' تک کی قربانی دے کر معاشرہ میں قرآن وحدیث کی تعلیم اور اسلامی عقائد ومعاشرت کو برقرار رکھا، ورنہ عالم اسباب میں اگر یہ مدارس نہ ہوتے تو اسپین کی طرح برصغیر پاک وہند میں بھی (نعوذ باللہ) اسلام ایک قصہ پارینہ بن چکا ہوتا۔ صدقہ خیرات، گھر گھر سے مانگی ہوئی روٹیوں اور عام لوگوں کے چندوں کی بنیاد پر قائم ہونے والا دینی مدارس کا یہ نظام برطانوی استعمار کی نظریاتی، فکری اور تہذیبی یلغار کے مقابلہ میں مسلمانوں کے لیے ایک مضبوط حصار ثابت ہوا اور اس نظام نے نہ صرف برصغیر پاک وہند وبنگلہ دیش کے مسلمانوں کے عقائد و افکار، معاشرت اور اسلامی علوم وفنون کی حفاظت کی بلکہ تحریک آزادی اور تحریک پاکستان کو نظریاتی

راہ نماؤں اور کارکنوں کی کھیپ بھی فراہم کی جس میں مولانا محمود حسن، مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا سید محمد داؤد غزنوی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور ان کے ہزاروں رفقا بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

دور غلامی میں دینی مدارس کی حکمت عملی دفاعی تھی جس کے لیے انہیں بہت سے تحفظات اختیار کرنے پڑے، اور اگر وہ ان تحفظات کے بارے میں سختی اختیار نہ کرتے تو اپنے بنیادی مقاصد کی طرف اس قدر کامیابی کے ساتھ پیش رفت نہ کر پاتے، لیکن قیام پاکستان کے بعد صورت حال خاصی تبدیل ہوگئی اور آزادی کے حوالے سے نئے تقاضے اور ضروریات سامنے آگئیں جن کے بارے میں دینی مدارس کی تمام تر مجبوریوں اور مشکلات کے باوجود بہر حال یہ کہنا پڑتا ہے کہ نئی ضروریات اور تقاضوں کو اپنے مقاصد میں شامل کرنے کے لیے وہ ابھی تک تیار نہیں ہوئے جس کے نقصانات قومی سطح پر بہت دیر تک محسوس کیے جاتے رہیں گے۔

قیام پاکستان کے بعد چاہیے تو یہ تھا کہ مساجد و مدارس کے لیے رجال کار کی فراہمی اور اسلامی علوم کی ترویج و تحفظ کی ذمہ داری ریاستی نظام تعلیم کے سپرد کر دی جاتی اور دینی مدارس کے الگ نظام کی ضرورت ہی باقی نہ رہتی، لیکن ریاستی نظام نے اس ذمہ داری کو قبول کرنے سے انکار کر دیا بلکہ ریاستی نظام تعلیم نے تو قیام پاکستان کے بعد آزادی اور ایک اسلامی ریاست کے مقاصد کے حوالے سے اس قدر مایوس کیا کہ آزاد قوموں کی تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ قیام پاکستان کے بعد ریاستی نظام تعلیم کی ذمہ داری تھی کہ وہ پاکستان کو صحیح معنوں میں اسلامی نظریاتی ریاست کی حیثیت دینے اور ایک فلاحی اسلامی معاشرہ کے قیام کے لیے فوج، بیورو کریسی، عدلیہ اور دیگر شعبوں میں اسلامی تعلیم و تربیت سے بہرہ ور افراد کار مہیا کرتا، معاشرہ کے عام افراد کو قرآن و سنت کی ضروری تعلیم سے آراستہ کرنے کا اہتمام کرتا، مساجد اور دینی مکاتب کا نظام چلانے کے لیے ائمہ اور مدرسین کی فراہمی کی ذمہ داری قبول کرتا، اسلامی تعلیمات و احکام کو عالمی برادری کے سامنے نئے انداز اور اسلوب سے پیش کرنے کے لیے اسکالرز تیار کرتا اور انہیں جدید علوم اور فلسفہ کے چیلنج کا سامنا کرنے کی تربیت دیتا، لیکن ریاستی نظام تعلیم نے نہ صرف یہ کہ

ان ذمہ داریوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا بلکہ عملاً یہ نظام سیکولر اور اسلام مخالف عناصر کی کمین گاہ ثابت ہوا اور پاکستان میں اسلامی احکام وتعلیمات کی ترویج کو روکنے اور اس کی اسلامی حیثیت کو غیر موثر بنانے میں اس نظام تعلیم نے مضبوط مورچے کا کام دیا، جبکہ اس کے برعکس دینی مدارس نے جو ذمہ داریاں ۱۸۵۷ء کے بعد قبول کی تھیں، اس راہ پر وہ اب بھی پوری دل جمعی کے ساتھ گامزن ہیں اور ان کے طریق کار اور دائرہ عمل میں کوئی فرق نمودار نہیں ہوا بلکہ اگر اس لحاظ سے دیکھا جائے کہ اسلامی علوم کی حفاظت وترویج اور مساجد ومدارس کے لیے ائمہ واساتذہ کی فراہمی کے لیے دینی مدارس کے کردار کا تسلسل کسی خلا اور تعطل کے بغیر بدستور قائم ہے تو ریاستی نظام تعلیم کے ساتھ تقابل کے تناظر میں دینی مدارس کا یہ کردار بڑے سے بڑے قومی اعزاز کا مستحق ہے، کیونکہ آج بھی ان دو مقاصد کے حوالے سے معاشرہ کی ضروریات یہی دینی مدارس پوری کر رہے ہیں اور اگر دینی مدارس اپنا یہ کردار چھوڑ دیں تو مساجد ومدارس کے لیے ائمہ واساتذہ کی فراہمی اور اسلامی علوم کی ترویج وحفاظت کے شعبہ میں جو خلا واقع ہوگا، وہ کسی باشعور شہری کے لیے قابل قبول نہیں ہوسکتا۔

دینی مداس کے موجودہ کردار اور خدمات کے بارے میں عام طور پر شکایات کا اظہار کیا جاتا ہے اور شکوہ کرنے والوں میں ہم بھی شامل ہیں، لیکن ان شکایات اور دینی مدارس کی مشکلات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینا ضروری ہے تاکہ صحیح صورت حال سامنے آسکے۔

دینی مدارس سے سب سے بڑی شکایت یہ کی جاتی ہے کہ ان کے نصاب میں آج کے علوم شامل نہیں ہیں اور وہ اپنے طلبہ کو انگریزی، ریاضی، سائنس، انجینئرنگ اور دیگر عصری علوم کی تعلیم نہیں دیتے۔ یہ شکایت ایسی ہے جسے نہ تو پوری طرح قبول کیا جاسکتا ہے اور نہ مسترد کیا جاسکتا ہے، کیونکہ جہاں تک عصری علوم کی مکمل تعلیم کا سوال ہے، وہ نہ تو دینی تعلیم کے نصاب کے ساتھ پوری طرح شامل کی جاسکتی ہے اور نہ ایسا کرنا ضروری ہے۔ شامل اس لیے نہیں کی جاسکتی کہ مستند اور پختہ عالم دین کا مقام حاصل کرنے کے لیے فارسی، عربی، صرف ونحو، قرآن وحدیث، فقہ واصول فقہ، معانی وادب اور منطق وفلسفہ جیسے علوم کا ایک مکمل نصاب ہے جسے پوری طرح پڑھے بغیر کوئی شخص عالم دین کے منصب پر فائز نہیں ہوسکتا اور یہ نصاب اس قدر بھاری بھرکم ہے کہ اس کے

ساتھ کسی دوسرے علم یا فن کے مکمل نصاب کو شامل کرنا ممکن نہیں ہے اور اگر اس نصاب میں کمی کی جائے تو دینی علوم میں مہارت کا پہلو تشنہ رہ جاتا ہے۔ اور ضروری اس لیے نہیں ہے کہ یہ تخصصات اور اسپیشلائزیشن کا دور ہے۔ اب ہر شعبہ کے لیے الگ ماہرین تیار ہوتے ہیں اور کسی ایک شعبہ کے ماہر کے لیے ضروری نہیں کہ وہ دوسرے شعبہ کی مہارت بھی رکھتا ہو۔ مثلاً کسی انجینئر کے لیے قطعی طور پر یہ ضروری نہیں کہ وہ میڈیکل سائنس کے علم سے بہرہ ور ہو اور کسی ڈاکٹر کے لیے ضروری نہیں کہ اس نے انجینئرنگ کا علم بھی حاصل کر رکھا ہو۔ اسی طرح کسی عالم دین کے لیے بھی یہ ضروری نہیں کہ وہ میڈیکل سائنس، انجینئرنگ یا کسی شعبہ کی مہارت رکھتا ہو۔

تاہم ایک فرق ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ جہاں تک کسی شعبہ میں پوری مہارت اور مکمل تعلیم کا تعلق ہے، وہ تو کسی دوسرے شعبہ کے فرد کے لیے ضروری نہیں ہے لیکن بنیادی اور جنرل معلومات ہر شعبہ کے بارے میں حاصل ہونی چاہئیں اور اس کی اہمیت وضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے جس طرح ہم یہ کہتے ہیں کہ کسی ڈاکٹر یا انجینئر کے لیے دین کا مکمل عالم ہونا ضروری نہیں مگر دین کی بنیادی معلومات ومسائل سے آگاہی ان کے لیے لازمی ہے تاکہ وہ اپنے شعبہ میں دینی احکام کے دائرہ کو ملحوظ رکھ سکیں، اسی طرح ایک عالم دین کے لیے ڈاکٹر یا انجینئر ہونا ضروری نہیں البتہ ان شعبوں کے بارے میں بنیادی معلومات علماء کو ضروری طور پر حاصل ہونی چاہئیں تاکہ وہ ان شعبوں کے افراد کی دینی راہ نمائی صحیح طور پر کر سکیں۔ اسی طرح انگریزی آج کی بین الاقوامی زبان ہے، اسلام اور عالم اسلام کے خلاف صف آرا عالمی میڈیا کی زبان ہے اور پاکستان کی دفتری اور عدالتی زبان ہے، اس لیے عربی کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان سے کما حقہ بہرہ ور ہونا علماء کے لیے آج کے دور میں ضروری ہے۔ اس بنا پر ہم دینی مدارس کے نصاب تعلیم میں کسی بنیادی تبدیلی یا تخفیف کی حمایت تو نہیں کریں گے، البتہ اس میں انگریزی زبان اور میڈیکل سائنس، جنرل سائنس، انجینئرنگ اور دیگر عصری علوم کے بارے میں بنیادی معلومات کی حد تک نصاب کے اضافے کو ضروری سمجھتے ہیں اور دینی مدارس کو اس طرف ضرور توجہ دینی چاہیے۔

اس سلسلے میں دینی مدارس کی مشکلات کو سامنے رکھنا بھی ضروری ہے۔ مثلاً ان کی ایک بنیادی مشکل یہ ہے کہ جو طلبہ انگریزی یا دیگر عصری علوم سے آراستہ ہو جاتے ہیں اور سرکاری اسناد حاصل کر لیتے ہیں، ان کی اکثریت مساجد یا دینی مدارس کے بجائے ملازمت کے لیے سرکاری اداروں کا رخ کرتی ہے جس کی وجہ سے مساجد و مدارس کو ضرورت اور معیار کے مطابق ائمہ، خطبا اور مدرس میسر نہیں آتے۔ ظاہر بات ہے کہ مساجد و مدارس میں مشاہروں اور دیگر سہولتوں کا مروجہ معیار کسی طرح بھی اس درجہ کا نہیں ہے کہ کوئی خطیب، امام یا مدرس اطمینان کے ساتھ ایک عام آدمی جیسی زندگی بسر کر سکے۔ پھر یہاں ملازمت کا تحفظ بھی نہیں ہے، اس لیے جسے سرکاری ملازمت میں جانے کا راستہ مل جاتا ہے، وہ لازماً ادھر کا رخ کرے گا اور مساجد و مدارس کے لیے رجال کار کے فقدان اور خلا کا مسئلہ پریشان کن صورت اختیار کر جائے گا۔

اس موقع پر حضرت مولانا مفتی محمود صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے ساتھ ایک گفتگو کا حوالہ دینا نامناسب نہ ہوگا۔ یہ اس دور کی بات کی ہے جب جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم نے وفاقی شرعی عدالت کے قیام کے بعد ضلع اور تحصیل کی سطح پر شرعی قاضی مقرر کرنے کا پروگرام بنایا تھا اور قاضی کورس کے لیے آرڈی نینس کے نفاذ کی تیاری ہو رہی تھی۔ حضرت مولانا مفتی محمود صاحبؒ راول پنڈی کینٹ کے ملٹری ہسپتال میں زیر علاج تھے۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس سلسلہ میں اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ مجھے پریشانی یہ تھی کہ پاکستان بھر میں ضلع اور تحصیل کی سطح پر مقرر کرنے کے لیے اس قدر تربیت یافتہ قاضی کہاں سے آئیں گے؟ اگرچہ اس زمانے میں بعض دینی اداروں نے قاضیوں کی تربیت کے لیے چار ماہ یا چھ ماہ اور ایک سال کے کورس شروع کر رکھے تھے لیکن میں ان سے مطمئن نہیں تھا کہ قاضی بہرحال قاضی ہوتا ہے اور سال چھ ماہ کا کورس کسی شخص کو قاضی نہیں بنا سکتا، اور اگر ہم نے پاکستان میں قاضی کورس کا آغاز اس طرح کے نیم قاضیوں سے کیا تو اسلام کے عدالتی نظام کا پہلا تاثر ہی اپنے نتائج کے لحاظ سے نقصان کا باعث بن سکتا ہے، چنانچہ میں نے مولانا مفتی محمودؒ سے سوال کیا کہ حضرت! یہ قاضی کہاں سے آئیں گے؟ مفتی صاحب نے جواب دیا کہ جن مدرسین نے دینی مدارس میں ہدایہ کی سطح تک کتابیں چار پانچ سال پڑھائی ہیں،

وہ نظام قضا کے مختصر کورس کے بعد قضا کا منصب سنبھال سکتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ میں اسے تسلیم کرتا ہوں، لیکن پہلے یہ دیکھ لیجیے کہ ضلع اور تحصیل کی سطح پر قاضی مقرر کرنے کے لیے پاکستان کے اضلاع اور تحصیلوں کی تعداد کے مطابق اس سطح کے مدرسین مل جائیں گے یا نہیں اور اگر ہمارے پاس اتنی تعداد میں اس معیار کے مدرسین مل بھی جائیں تو انہیں عدالتوں میں بھیج کر دینی مدارس میں ہدایہ کی سطح کی کتابیں کون پڑھائے گا؟ اس سوال کا جواب حضرت مفتی محمودؒ نے اپنے مخصوص انداز میں ٹال دیا، لیکن میں نے ان کے چہرے کی سلوٹوں سے اندازہ لگا لیا کہ اس سوال نے خود انہیں بھی پریشان کر دیا ہے۔

دینی مدارس کو ابھی تک اپنے وجود کے تحفظ اور اپنے کردار کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے تحفظات کی فضا کا سامنا ہے اور وہ اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ اپنی تیار کردہ کھیپ کو دوسرے شعبوں کے حوالے کر کے اپنے کام کو جاری رکھ سکیں۔ اس لیے اگر دینی مدارس اپنے تیار کردہ افراد کو مسجد و مدرسہ تک محدود رکھنے کے لیے کچھ تحفظات اختیار کیے ہوئے ہیں تو ان کی اس مشکل کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

پھر ایک اور پہلو سے بھی اس مسئلہ کا جائزہ لینا مناسب ہوگا۔ وہ یہ کہ اس وقت پاکستان بھر میں مساجد میں امامت وخطابت کے فرائض سرانجام دینے والے افراد میں مستند وغیر مستند کا تناسب کیا ہے؟ اگر اس کا غیر جانب دارانہ سروے کیا جائے تو غیر مستند ائمہ وخطبا کا تناسب مستند حضرات سے کہیں زیادہ ہوگا اور ہمارے ہاں مذہبی معاملات میں خرابیوں کی ایک بڑی وجہ یہی ہے جس کی طرف اکثر حضرات کی توجہ نہیں ہے، اور جو اہل دانش اس کا ادراک رکھتے ہیں، وہ کسی فتوے کی زد میں آنے کے خوف سے اس کا اظہار نہیں کرتے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے جس کو تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ کار نہیں اور اسلامی نظریاتی ریاست ہونے کے ناتے سے اسٹیٹ کی ذمہ داری ہے کہ جس طرح دوسرے شعبوں میں ان کوالیفائیڈ افراد کی حوصلہ شکنی کرتے ہوئے کوالیفائیڈ افراد کی فراہمی پر زور دیا جاتا ہے، امامت وخطابت اور دینی تعلیم کے شعبہ میں بھی ان کوالیفائیڈ افراد کا تناسب کم سے کم کرنے اور بالآخر اسے ختم کرنے کی پالیسی اختیار کی جائے اور جس طرح ملک میں

خواندگی کا تناسب بہتر بنانے کے لیے پرائیویٹ تعلیمی اداروں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اور ایک معقول بجٹ اس کام کے لیے مخصوص کیا جاتا ہے، دینی شعبہ میں کوالیفائیڈ افراد کا تناسب بڑھانے کے لیے دینی مدارس کی حوصلہ افزائی کی جائے اور قومی تعلیمی بجٹ میں ان کے لیے معقول حصہ مختص کیا جائے۔

دینی مدارس سے دوسری شکایت یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے مختلف شعبوں، بالخصوص عدلیہ میں مطلوبہ معیار کے رجال کار کی فراہمی کو دینی مدارس کے نظام نے اپنے مقاصد میں شامل نہیں کیا۔ یہ کام اگرچہ اصلاً ریاستی نظام تعلیم کا تھا لیکن ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ ریاستی نظام تعلیم نے اس سمت نے سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی اور اس کے بعد اس خلا کو پر کرنے کے لیے لوگوں کی نظریں بہرحال دینی مدارس کی طرف اٹھتی ہیں۔ اگر دینی مدارس اپنے نصاب تعلیم کا از سر نو جائزہ لے کر اسلام کو بطور نظام زندگی دوسرے مروجہ نظاموں کے ساتھ تقابل کے ساتھ پڑھانے کا اہتمام کرتے اور اجتماعی زندگی سے تعلق رکھنے والے حدیث وفقہ کے ابواب کو ضروری اہمیت کے ساتھ پڑھایا جاتا تو دینی مدارس سے فارغ ہونے والے علمائے کرام اسلامی نظام کے نفاذ کی جدوجہد کے تربیت یافتہ اور شعوری کارکن ثابت ہوتے اور اس کے ساتھ اگر تجارت، عدالت، انتظامیہ اور دیگر شعبوں کے افراد کے لیے ہلکے پھلکے کورسز تیار کر کے انہیں دینی مدارس کے تعلیمی دائرہ میں شریک کر لیا جاتا تو اسلامی نظام کے لیے رجال کار کی فراہمی کی ایک اچھی بنیاد مل سکتی تھی، لیکن ایسا نہیں ہوا اور اس کے نتائج آج معاشرہ میں فکری انتشار اور اخلاقی انارکی کی صورت میں سب کے سامنے ہیں۔

دینی مدارس سے تیسری شکایت اسلام کے بارے میں مغربی لابیوں اور ورلڈ میڈیا کے منفی پراپیگنڈا کی صورت میں سامنے آنے والے چیلنج کو نظر انداز کرنے کی ہے۔ آج اقوام متحدہ کے چارٹر، جنیوا انسانی حقوق کمیشن کی قراردادوں اور بنیادی حقوق کے مغربی تصورات کے حوالہ سے اسلامی احکام اور قوانین کا مذاق اڑایا جا رہا ہے، جرائم کی شرعی سزاؤں کو انسانی حقوق کے منافی قرار دیا جا رہا ہے، ارتداد اور توہین رسالت پر قدغن کے بارے میں اسلامی قوانین کو آزادیٔ

رائے کے بنیادی حق سے متصادم کہا جا رہا ہے اور دنیا میں کسی بھی جگہ اسلامی معاشرہ کے قیام کو قرون وسطیٰ کے ظالمانہ دور کی واپسی سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ اس چیلنج کا سامنے کرنے اور آج کی زبان میں اسلام کو انسانی حقوق کے علمبردار اور محافظ نظام کے طور پر پیش کرنے کے لیے لوگوں کی نظریں دینی مداس اور اداروں کی طرف اٹھتی ہیں اور عام مسلمان یہ توقع کرتا ہے کہ جس طرح دینی مدارس کے نظام نے برطانوی استعمار کے دور میں اعتقادی اور معاشرتی فتنوں کا دل جمعی سے مقابلہ کیا تھا، آج بھی وہ مغربی فلسفہ کی نئی اور تازہ دم یلغار کے سامنے خم ٹھونک کر میدان میں آئے گا، مگر چند استثناؤں کو چھوڑ کر دینی مدارس میں اس چیلنج کے ادراک کی فضا ہی سرے سے موجود نہیں جو بلاشبہ ایک بہت بڑا المیہ ہے۔

دینی مدارس سے چوتھی شکایت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے اساتذہ اور طلبہ کو گفتگو اور مباحثہ کے نئے اسلوب اور ہتھیاروں سے روشناس نہیں کرایا۔ فتویٰ اور مناظرہ کی زبان قصہ پارینہ بن چکی ہے مگر دینی مدارس بلکہ ہمارے منبر ومحراب پر بھی ابھی تک اسی زبان کا سکہ چلتا ہے۔ اخبارات پڑھنے والے اور ٹی وی دیکھنے والوں کے لیے ہماری زبان اور اسلوب بیان دونوں اجنبی ہو چکے ہیں مگر ہم کوئی پروا کیے بغیر اسی ڈگر پر قائم ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اکثر وبیشتر دینی مجالس میں تعلیم یافتہ لوگوں کا تناسب دن بدن کم ہوتا جا رہا ہے۔ آج کی زبان منطق واستدلال کی زبان ہے، مشاہدات کی زبان ہے، کسی بھی مسئلہ کو اس کے پس منظر اور نتائج کے ساتھ پیش کرنے کی زبان ہے، اور انسانی حقوق کے حوالے سے گفتگو کی زبان ہے، مگر دینی مدارس کے اساتذہ اور طلبہ کی اکثریت اس زبان سے ناآشنا ہے اور ستم بالائے ستم کہ اچھا بولنے اور اچھا لکھنے والوں کا تناسب جو دینی حلقوں میں پہلے ہی بہت کم تھا، مزید کم ہوتا جا رہا ہے۔ انگلش اور عربی تو رہی ایک طرف، اردو زبان میں اپنے مافی الضمیر کو اچھی تحریر کی صورت میں پیش کرنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ ایک پختہ کار عالم دین نے شکایت کی کہ فلاں قومی اخبار کو میں نے درجنوں مضامین بھجوائے ہیں، ان میں سے ایک بھی شائع نہیں ہوا۔ میں نے اس اخبار کے ایڈیٹر سے بات کی تو انہوں نے جواب دیا کہ جو مضمون ہمیں پورے کا پورا از سر نو لکھنا پڑے، اسے شائع کرنے کا تکلف ہم کس طرح کر سکتے ہیں؟

دینی مدارس سے پانچویں شکایت یہ ہے کہ دینی اور اخلاقی تربیت کا جو ماحول کچھ عرصہ پہلے تک ان مدارس میں قائم رہا ہے، وہ ختم ہوتا جا رہا ہے اور گنتی کے چند اداروں کے سوا دینی مدارس کی اکثریت ایسی ہے جن میں طلبہ کی فکری، دینی اور اخلاقی تربیت کا نظام موجود نہیں ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مدارس سے فارغ ہونے والے فضلا کی اکثریت کے ذہنوں میں مشنری جذبہ کے طور پر کوئی واضح اور متعین مقصد زندگی نہیں ہوتا اور اگر کسی کے ذہن میں کوئی مقصد ہو بھی تو اس کے مطابق اس کی تربیت نہیں ہوتی اور اس کے نقصانات بھی قدم قدم پر سامنے آ رہے ہیں۔

دینی مدارس سے چھٹی شکایت یہ ہے کہ ان کا باہمی ربط ومشاورت کا نظام انتہائی کمزور ہے۔ پہلے تو بالکل نہیں تھا مگر کچھ عرصہ سے تمام مذہبی مکاتب فکر کے مدارس نے اپنے اپنے وفاق قائم کر لیے ہیں جو اگرچہ فرقہ ورانہ بنیادوں پر ہیں لیکن اپنے اپنے مکتب فکر کی حد تک انہوں نے باہمی ربط کا ایک نظام قائم کر لیا ہے جس سے امتحانات کی صورت حال بہتر ہوئی ہے اور کچھ دیگر فوائد بھی سامنے آئے ہیں، لیکن معاشرہ میں دینی مدارس کی کارکردگی اور اثرات کا دائرہ جس قدر وسیع ہے، اس کے مطابق موجودہ ربط ونظم قطعی طور پر ناکافی ہے جس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ مدارس کے قیام میں کوئی منصوبہ بندی اور ترجیحات نہیں ہیں۔ جہاں جس کا جی چاہتا ہے، ضرورت اور تقاضوں کو ملحوظ رکھے بغیر کسی بھی معیار اور سائز کا دینی ادارہ قائم کر لیتا ہے اور چونکہ اوپر چیکنگ کا کوئی نظم موجود نہیں ہے، اس لیے کارکردگی اور اخراجات کا دائرہ شخص واحد یا زیادہ سے زیادہ اس کے منظور نظر چند افراد تک محدود رہتا ہے۔ ان خود رو دینی مدارس میں ایک بڑی تعداد ایسے اداروں کی ہے جو تعلیمی اداروں کے بجائے ''مذہبی دکانیں'' کہلانے کے زیادہ حق دار ہیں اور ان میں مالی بدعنوانیوں کا سلسلہ دراز ہوتا جا رہا ہے۔

ضیاء الحق مرحوم کے دور میں سرکاری زکوٰۃ کا ایک حصہ دینی مدارس کے لیے مخصوص کیا گیا تو اس کے حصول کے لیے دنوں میں کئی مدرسے وجود میں آ گئے اور پھر سرکاری زکوٰۃ کی رقم حاصل کرنے کے لیے رشوت، سفارشات اور بدعنوانیوں کے جو دروازے کھلے، انہوں نے دینی اداروں کو بھی دیگر سرکاری محکموں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ اس سلسلہ میں مدارس کو تین حصوں میں

تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک حصہ وہ معیاری دینی ادارے ہیں جنہوں نے سرکاری زکوٰۃ کی وصولی سے گریز کیا اور اپنی چادر کے دائرے میں پاؤں پھیلانے کے باوقار طریق کار پر گامزن رہے۔ دوسرے نمبر پر وہ دینی ادارے ہیں جو اپنی کارکردگی اور معاملات میں دیانت اور اعتماد کے معیار پر پورے اترتے ہیں اور انہوں نے سرکاری زکوٰۃ وصول کر کے اسے صحیح مصرف پر صرف کیا۔ اور تیسرے نمبر پر وہ مدارس ہیں جنہوں نے سرکاری زکوٰۃ وصول اور خرچ کرنے میں کسی دینی اور اخلاقی معیار کی پابندی کا تکلف گوارا نہیں کیا۔ بدقسمتی سے سرکاری ریکارڈ میں تیسری قسم کے مدارس کی فہرست زیادہ لمبی ہے اور دینی مدارس کے مجموعی نظام کے بارے میں سرکاری محکموں کی رائے قائم ہونے میں یہی فہرست بنیاد بن رہی ہے۔

پھر چند بڑے اور معیاری دینی مدارس کو چھوڑ کر اکثر و بیشتر دینی مدارس نے عوامی چندہ کے حصول کے لیے جو طریقے کچھ عرصہ سے اختیار کر لیے ہیں، انہوں نے چندہ دینے والے اصحاب خیر کو پریشان کر دیا ہے اور اس سے مدارس کی نیک نامی اور اعتماد مجروح ہو رہا ہے۔ کراچی، فیصل آباد اور گوجرانوالہ جیسے کاروباری شہروں میں رمضان المبارک کے دوران میں مساجد اور دکانوں پر دینی مدارس کے سفیروں کی جو یلغار ہوتی ہے اور لوگوں کی توجہ زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کے لیے گفتگو کا جو اسلوب اختیار کیا جاتا ہے، اس سے دینی اداروں کے اعتماد اور وقار کا گراف تیزی کے ساتھ نیچے جا رہا ہے۔ اس میں کوئی مبالغہ کی بات نہیں کہ کاروباری شہروں میں بہت سے دوکاندار رمضان المبارک کے دوران میں سفیروں کی یلغار کے خوف سے خود اپنی دکانوں پر بیٹھنے سے کترانے لگے ہیں اور مساجد میں نمازوں کے بعد کھڑے ہو کر اپیل کرنے والے سفیروں کو اب نمازیوں نے ٹوکنا شروع کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ پریشان کن صورت حال پاکستان سے باہر لندن میں دیکھنے میں آتی ہے جہاں پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش کے مدارس کے سفرا نماز کے بعد کھڑے ہو کر اپنے مدرسے کے لیے اپیل کرتے ہیں اور پھر دروازے پر رومال بچھا کر بیٹھ جاتے ہیں جہاں نمازی گزرتے ہوئے پاؤنڈ اور سکے پھینکتے جاتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ میرے جیسے حساس دینی کارکن کی نظریں شرم سے زمین پر گڑ جاتی ہیں۔ ابھی چند ماہ قبل جنگ

لندن میں ایک مسلم نوجوان کا مراسلہ شائع ہوا جس میں اس نے بتایا کہ برطانیہ میں پلنے بڑھنے والے مسلمان نوجوانوں کی اکثریت مساجد میں اس لیے نہیں آتی کہ ایک تو ائمہ اور خطبا کی زبان ان کی سمجھ میں نہیں آتی، دوسرے جن موضوعات پر وہ گفتگو کرتے ہیں، ان سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہے، تیسرے ہر نماز کے بعد کسی نہ کسی مدرسہ کا سفیر چندہ کے لیے کھڑا ہوتا ہے اور ان کے پاس ہر آدمی کو دینے کے لیے اتنے پیسے نہیں ہوتے۔ یہ صورت حال برطانیہ کی مساجد کی ہے جو ہزاروں میل دور اور اکثر مدارس کے سفرا کی دسترس سے باہر ہے۔ جب وہاں کا یہ حال ہے تو اپنے ملک کی مساجد کا کیا حال ہو سکتا ہے؟ اور قیاس کرنے کی ضرورت کیا ہے، سارا منظر تو ہم رمضان المبارک میں اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔

یہ بات نہیں کہ لوگ دینی مدارس سے تعاون نہیں کرتے، اس لیے مدارس کو مجبوراً ایسے طریقے اختیار کرنا پڑتے ہیں۔ یہ بات نہیں ہے، کیونکہ بیسیوں ایسے اداروں کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں جن کا سالانہ بجٹ لاکھوں سے متجاوز ہے اور بعض کا کروڑوں کی حدود میں قدم رکھ رہا ہے۔ وہ مدارس نہ سرکاری امداد لیتے ہیں اور نہ ہی ان کے سفیر اس طرح چندہ کے لیے گھومتے پھرتے ہیں، مگر ان کا بجٹ صاحب خیر مسلمانوں کے تعاون سے باوقار طریقہ سے فراہم ہو جاتا ہے۔

یہ ہے دینی مدارس کا ماضی اور حال جسے اب پاکستان کی وزارت داخلہ اور اس سے بڑھ کر بین الاقوامی سطح پر ایمنسٹی انٹرنیشنل اپنی تحقیقات اور سروے کی بنیاد بنا کر دنیا کو ان کی منفی تصویر دکھانے کے درپے ہے۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کا تو یہ نظریاتی محاذ ہے۔ وہ مغربی حکومتوں اور لابیوں کی نمائندہ ہے جن کا موقف یہ ہے کہ اسلام آج کے دور میں بطور نظام زندگی قابل عمل نہیں ہے اور اسلامی احکام وقوانین انسانی حقوق کے منافی ہیں، اس لیے عالم اسلام میں دینی بیداری کی تحریکات کو ناکام بنانا ضروری ہے، ورنہ قرون وسطیٰ کا وحشیانہ دور پھر واپس آ سکتا ہے جس سے ویسٹرن سولائزیشن اور تہذیب وترقی سب کچھ کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس لیے مغربی حکومتیں اور ان کے مفاد میں کام کرنے والی لابیاں عالم اسلام میں دینی بیداری کے سرچشموں کو بند کرنا چاہتی ہیں۔ ان کی نظر میں پاکستان دنیا کا سب سے بڑا بنیاد پرست مسلمان ملک ہے اور پاکستان کی بنیاد

پرستی کا سرچشمہ دینی مدارس ہیں، اس لیے دینی مدارس کو غیر موثر بنانا اور عوام کے ساتھ ان کے اعتماد کے رشتے کو ختم کرنا ضروری ہے۔ اسی بنیاد پر علمائے کرام اور دینی مدارس کی کردار کشی اور انہیں منتشر رکھنے پر کروڑوں ڈالر خرچ کیے جا رہے ہیں۔

ایمنسٹی انٹرنیشنل اسی مہم کو لے کر آگے بڑھنا چاہتی ہے اور پاکستان کے غیر معیاری اور برائے نام دینی مدارس کو بنیاد بنا کر ایک رپورٹ دنیا کے سامنے لانے کی کوشش کر رہی ہے جس میں دکھایا جائے گا کہ پاکستان کے دینی مدارس میں طلبہ کو آج کے تقاضوں سے بے خبر رکھا جاتا ہے، انہیں مارا جاتا ہے، زنجیروں سے باندھا جاتا ہے، ان سے جبری بیگار لی جاتی ہے، ان کی خوراک، رہائش اور صفائی کا معیار ناقص ہے، انہیں ان مدارس میں آزادئ رائے اور دیگر بنیادی حقوق حاصل نہیں ہیں، انہیں جان بوجھ کر ناقص رکھا جا رہا ہے تاکہ وہ قومی زندگی کے کسی شعبے میں کھپ نہ سکیں، ان کے نام پر چندہ جمع کر کے مدارس کے منتظمین کھا پی جاتے ہیں اور طلبہ کو انتہائی تنگی کی حالت میں رکھ کر خود عیش کی زندگی بسر کرتے ہیں، اور ان مدارس میں طلبہ کو اسلحہ کی ٹریننگ دے کر دہشت گرد بنایا جا رہا ہے۔ یہ سب کچھ ایمنسٹی انٹرنیشنل کی اس رپورٹ کا حصہ ہوگا جو اگلے سال جون تک منظر عام پر آ رہی ہے اور اس کے لیے بطور خاص ایسے غیر معیاری مدارس کو سروے کی بنیاد بنایا جا رہا ہے جہاں یہ سب کچھ ہوتا ہے تاکہ رپورٹ پر ''غیر حقیقت پسندانہ'' اور ''خلاف واقعہ'' ہونے کا الزام عائد نہ کیا جا سکے۔ اس سروے مہم میں ایمنسٹی انٹرنیشنل کی کوئی ٹیم معیاری دینی مدارس میں نہیں جائے گی اور نہ ہی رپورٹ میں ان کا تذکرہ ہوگا۔ پاکستان کی وزارت داخلہ اور دیگر محکمے اس مہم میں ایمنسٹی انٹرنیشنل کے معاون ہیں اور دینی مدارس کے خلاف اس مہم میں ان کے مقاصد بھی اس سے مختلف نہیں ہیں۔

کسی بھی طبقے کی کمزوریاں ہمیشہ اس کے خلاف دشمن کا ہتھیار بنتی ہیں اور دینی مدارس کے نظام سے نالاں قوتوں نے اس کے خلاف ان کمزوریوں کو ہتھیار بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس لیے دینی مدارس کو اور دینی مدارس کے وفاقوں کو خود احتسابی کا ایک مضبوط نظام قائم کرنا ہوگا اور اپنی کمزوریوں کو خود اپنے ہاتھوں دور کرنے کا اہتمام کرنا ہوگا، ورنہ یہ کمزوریاں ان کے خلاف صرف

مغربی لابیوں کی پراپیگنڈا مہم کا ہتھیار نہیں ہوں گی بلکہ ان مدارس پر ریاستی کنٹرول کی مہم میں بھی معاون ثابت ہوں گی۔ اس لیے ہم دینی مدارس کے ارباب حل وعقد کی خدمت میں عرض کریں گے کہ:

☆ تمام مکاتب فکر کے دینی مدارس کے الگ الگ وفاق اپنا وجود اور نظم قائم رکھتے ہوئے ایک مشترکہ بورڈ قائم کریں اور مشترکہ معاملات کو اس بورڈ کے ذریعے سے کنٹرول کیا جائے۔

☆ درس نظامی کے موجودہ نصاب کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں انگریزی زبان اور عصری علوم کو بنیادی معلومات کی حد تک ضرور شامل کیا جائے۔

☆ گفتگو اور مباحثہ کے جدید اسلوب اور انگریزی اور اردو میں صحافتی زبان سے طلبہ کو متعارف کرایا جائے۔

☆ اسلام کو بطور نظام حیات پڑھایا جائے اور دیگر نظام ہائے حیات کے ساتھ تقابلی مطالعہ کرا کے نظام شریعت کی اہمیت وضرورت کو ان کے ذہنوں میں اجاگر کیا جائے۔

☆ مدارس کی درجہ بندی کر کے ہر علاقہ میں وہاں کی ضرورت کے مطابق مدارس کے قیام کے لیے قومی سطح پر منصوبہ بندی کی جائے۔

☆ اباحیت مطلقہ (فری سوسائٹی) کے مغربی تصور اور انسانی حقوق کے مغربی فلسفہ کے پس منظر اور نتائج سے طلبہ کو آگاہ کیا جائے۔

☆ دینی، اخلاقی اور روحانی تربیت کا بطور خاص اہتمام کیا جائے اور دینی مقاصد کے حصول کے لیے ان میں مشنری جذبہ کو اجاگر کیا جائے۔

☆ مالی امداد کے حصول کے لیے باوقار اور آبرومندانہ طریق کار کی پابندی اور غیر معیاری طریقوں کی حوصلہ شکنی کی جائے اور اس سلسلہ میں وفاقوں کی سطح پر ضابطہ اخلاق طے کر کے مدارس سے اس کی پابندی کرائی جائے۔

☆ اساتذہ کے مشاہروں اور طلبہ کی رہائش، خوراک اور صفائی کے معیار کو بہتر بنایا جائے اور کام کو پھیلانے کے بجائے تھوڑے اور معیاری کام کو اصول قرار دیا جائے۔

☆مسلم معاشرہ میں دینی مدارس کی اہمیت، خدمات اور کردار کے حوالہ سے معیاری مضامین کی انگلش اور اردو میں قومی اور بین الاقوامی سطح پر اشاعت کا اہتمام کیا جائے۔

☆ہمیں امید ہے کہ دینی مدارس کے ارباب حل وعقد ان گزارشات پر ہمدردانہ غور فرما کر اصلاح احوال کی ضروری تدابیر اختیار کریں گے تاکہ دینی مدارس کا یہ نظام ماضی کی طرح مستقبل میں بھی اسلامی علوم کی حفاظت اور اسلامی معاشرہ کی تشکیل میں مفید اور موثر کردار ادا کر سکے۔

(ماہنامہ الشریعہ، جنوری ۱۹۹۵ء)

دینی مدارس کا نصاب تعلیم اور جدید تقاضے

دینی مدارس میں مروج نصاب تعلیم کو درس نظامی کا نصاب کہا جاتا ہے جو ملا نظام الدین سہالویؒ سے منسوب ہے۔ ملا نظام الدین سہالویؒ (المتوفی ۱۱۶۱ھ) حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے معاصرین میں تھے۔ ان کا قدیمی تعلق ہرات (افغانستان) کے معروف بزرگ حضرت شیخ عبداللہ انصاریؒ سے تھا۔ اس خاندان کے شیخ نظام الدینؒ نامی بزرگ نے یوپی کے قصبہ سہالی میں کسی دور میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا تھا اور پھر ان کے خاندان میں یہ سلسلہ نسل درنسل چلتا رہا۔ اکبر بادشاہ نے اپنے دور میں اس خاندان کو سہالی میں معقول جاگیر دے دی تھی جس کی وجہ سے خاندانی اور تدریسی نظام کسی رکاوٹ اور دقت کے بغیر چلتا رہا حتیٰ کہ اورنگ زیب عالمگیرؒ کے دور میں سہالی کے شیخ زادوں نے کسی تنازع کی بنیاد پر اس خاندان کے بزرگ ملا قطب الدینؒ کو شہید کر کے ان کا گھر، سامان اور کتب خانہ جلا دیا اور اس خاندان کو سہالی کا قصبہ چھوڑنا پڑا۔ سلطان اورنگ زیب عالمگیرؒ نے ۱۱۰۵ھ میں لکھنؤ میں ''فرنگی محل'' کے نام کی ایک کوٹھی انہیں الاٹ کی جوان کی تدریسی اور علمی سرگرمیوں کا مرکز بن گئی اور علمائے فرنگی محل کا وہ عظیم علمی خاندان پورے برصغیر میں متعارف ہوا جس میں ملا نظام الدین سہالویؒ، مولانا عبدالحلیم فرنگی محلیؒ اور مولانا عبدالحئ فرنگی محلیؒ جیسے اکابر ومشاہیر کے نام بھی شامل ہیں۔

اس دور میں برصغیر میں فقہ اور معقولات کی تعلیم کا دور دورہ تھا اور فرنگی محل کے علماء ان دونوں علوم میں نمایاں اور امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کا اپنا ایک انداز تعلیم تھا اور تعلیمی نصاب بھی خود ان کا اپنا طے کردہ تھا۔ یہ نصاب تعلیم دراصل اس خاندان کے مسلسل تجربات کا نچوڑ اور حاصل تھا

جسے ملا نظام الدین سہالویؒ نے مرتب شکل میں پیش کیا اور اسی وجہ سے ان سے منسوب ہو کر ''درس نظامی'' کہلایا۔ اس نصاب میں درج ذیل گیارہ علوم وفنون میں اس دور کی بہترین کتابیں شامل کی گئیں: ۱۔ صرف، ۲۔ نحو، ۳۔ منطق، ۴۔ حکمت وفلسفہ، ۵۔ ریاضی، ۶۔ بلاغت، ۷۔ فقہ، ۸۔ اصول فقہ، ۹۔ علم کلام، ۱۰۔ تفسیر قرآن، ۱۱۔ حدیث۔

اس نصاب کے ساتھ اس خاندان کا طرز تدریس روایتی اور کتابی تھا جس میں کتاب کا متن، حاشیہ اور حاشیہ در حاشیہ سمجھنے اور حل کرنے کی صلاحیت بڑھانے پر زور دیا جاتا تھا اور کتاب کے نفس مضمون کی بہ نسبت اس کے دیگر متعلقات وتفصیلات کی طرف استاذ اور شاگرد کی توجہ زیادہ ہوتی تھی۔ اس طرز تدریس کی افادیت یہ تھی کہ اس سے ذہن وفکر کو تعمق اور گہرائی حاصل ہوتی تھی اور مطالعہ واستنباط کی صلاحیت میں اضافہ ہوتا تھا۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کی ناکامی اور پورے جنوبی ایشیا میں صدیوں سے چلے آنے والے ہزاروں دینی مدارس کی یک لخت بندش وخاتمہ کے بعد جب حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت حاجی عابد حسینؒ جیسے بزرگوں نے ضلع سہارنپور کے قصبہ دیوبند میں رضا کارانہ چندہ اور امداد باہمی کی بنیاد پر ۱۸۶۵ء میں مدرسہ عربیہ کے نام سے ایک نئی درس گاہ قائم کی تو اس میں درس نظامی کے اسی نصاب کو تعلیم وتدریس کے نئے سلسلہ کی بنیاد بنایا اور یہی سلسلہ آگے چل کر پورے جنوبی ایشیا میں آزاد دینی مدارس کے ایک وسیع نظام کا نقطۂ آغاز قرار پا گیا۔ مگر دیوبند کے حضرات نے درس نظامی کے نصاب کو من وعن قبول نہیں کیا بلکہ اس میں اس وقت کی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے ترمیم واضافہ بھی کیا۔ ان حضرات کا علمی وفکری تعلق حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ سے تھا اور جہاد بالاکوٹ کی ناکامی کے باعث ولی اللہی خاندان کے مسند نشین حضرت شاہ محمد اسحاق دہلویؒ کی حجاز مقدس کی طرف ہجرت کے بعد اس خاندان کے علمی ورثہ اور فکری مشن کے یہی حضرات وارث تھے، اس لیے انہوں نے دونوں علمی سرچشموں کے درمیان سنگم اور پل کی حیثیت اختیار کر لی اور درس نظامی کے مذکورہ نصاب کے ساتھ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے علوم وفلسفہ کا جوڑ لگا کر ایک ایسا نصاب تعلیم رائج کیا جو تھوڑے بہت ردوبدل کے ساتھ جنوبی ایشیا کے اکثر دینی مدارس میں اس

وقت بھی رائج ہے اور اب تک مختلف ادوار اور مختلف حلقوں کی ترامیم اور اضافہ کے باوجود ''درس نظامی'' ہی کہلاتا ہے۔

دار العلوم دیوبند نے جب اس نصاب کو اپنایا تو اس وقت کی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے اس میں دو بنیادی تبدیلیاں کیں۔ ایک یہ کہ درس نظامی کے پرانے نصاب میں حدیث کی صرف ایک کتاب، مشکوۃ شریف تھی لیکن حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تعلیمات وارشادات کو سامنے رکھتے ہوئے دیوبند کے نصاب میں صحاح ستہ یعنی بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور نسائی کو بھی شامل کرلیا گیا۔ یہ اس وقت کی اہم ضرورت تھی جسے دیوبند کے اکابر نے محسوس کرتے ہوئے نصاب کے اندر سمو دیا۔ اسی طرح جہاد بالاکوٹ کے بعد جب حضرت شاہ محمد اسحاق دہلویؒ ہجرت کر کے حجاز مقدس چلے گئے تو ان کی جگہ دہلی کی مسند حدیث پر حضرت میاں نذیر حسین محدث دہلویؒ متمکن ہوئے جن کا رجحان حنفیت سے گریزاں اس مکتب فکر کی طرف تھا جو بعد میں اہل حدیث کے نام سے موسوم ہوا۔ ظاہر ہے کہ حدیث کی تعلیم میں ان کے ہاں انہی احادیث وروایات کی ترجیح کا پہلو غالب ہونا تھا جو ان کے رجحانات سے مطابقت رکھتا تھا اس لیے یہ تاثر عام ہونے لگا کہ حدیث نبویؐ اور فقہ حنفی الگ الگ بلکہ ایک دوسرے کے مقابل علوم کا نام ہے۔ اس تاثر کو دور کرنے کے لیے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے حدیث کی تعلیم وتدریس کے دوران میں فقہ حنفی کے مسائل واحکام کے احادیث نبویہؐ سے اثبات اور ان کی ترجیح کے طرز کو اپنایا جسے بعد میں حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ اور حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ نے کمال تک پہنچا دیا۔

ان دو تبدیلیوں میں سے ایک کا تعلق نصاب میں اضافہ سے ہے اور دوسری تبدیلی طرز تدریس سے تعلق رکھتی ہے جو ظاہر ہے اس وقت کی ضروریات اور تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے عمل میں لائی گئیں، لیکن اس کے بعد نصاب اور طرز تعلیم پر جمود کی ایسی مہر ثبت کر دی گئی کہ زمانے کی ضروریات اور تقاضوں سے آنکھیں بند کر لینے کو ہی عافیت کا واحد ذریعہ سمجھ لیا گیا حتیٰ کہ بڑے بڑے اکابر چیختے چلاتے رہ گئے مگر مدارس دینیہ کے ارباب حل وعقد کے کانوں پر جوں تک نہیں

رینگی۔اس سلسلہ میں ارباب مدارس کے بھی کچھ تحفظات اور مجبوریاں ہیں جو ہمارے پیش نظر ہیں اور ہم نے اپنے مضامین میں ان کا تفصیل سے ذکر کیا ہے لیکن ان تحفظات اور مجبوریوں کے دائرے قائم رکھتے ہوئے بھی جو ضروری ترامیم اور اضافے آسانی کے ساتھ ہو سکتے تھے، بدقسمتی سے انہیں بھی نظر انداز کر دیا گیا اور ابھی تک مسلسل نظر انداز کیا جا رہا ہے۔

حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ ہمارے دور کے اکابر علماء میں سے تھے اور ان کا شمار حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ کے ابتدائی دور کے مایہ ناز شاگردوں میں ہوتا ہے جب حضرت شاہ صاحبؒ دارالعلوم دیوبند میں پڑھایا کرتے تھے۔مولانا نعمانی اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں کہ جس سال وہ دورۂ حدیث سے فارغ ہوئے تو حضرت شاہ صاحبؒ نے دورۂ حدیث کے طلبہ کو رخصت کرنے سے قبل ایک خصوصی نشست میں ہدایات اور نصائح سے نوازا جن میں سب سے اہم نصیحت یہ تھی کہ اگر اسلام کی دعوت وتبلیغ کا کام صحیح طریقے سے کرنا چاہتے ہو تو اس کے لیے انگریزی زبان سیکھنا ضروری ہے۔اس واقعہ کو پون صدی گزر چکی ہے مگر ہمارے مدارس اب بھی انگریزی زبان کے بارے میں تردد کا شکار ہیں کہ سرے سے اس کی ضرورت بھی ہے یا نہیں؟

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہ العزیز نے بھی اس مسئلے پر بہت کچھ فرمایا مگر ان کی آواز بھی صدا بصحرا ثابت ہوئی۔میں اس موقع پر ان کے دو تین ارشادات نقل کرنا چاہوں گا جس سے بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ دینی مدارس کے نصاب ونظام میں تبدیلی کی ضرورت پر اکابر علماء کے احساسات اور اس کے ارباب اختیار کے ذہنی وفکری جمود کے درمیان کتنا فاصلہ تھا۔

حضرت تھانویؒ قرآن کریم کی تدریس کے مروجہ طرز پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''قرآن شریف کا طرز عام مصنفین کے طرز پر نہیں ہے بلکہ محاورہ بول چال کا طرز ہے۔نہ اس میں اصطلاحی الفاظ کی پابندی۔ناواقف لوگ اس کو عام تصانیف کے طریقہ پر منطبق کرنا چاہتے ہیں، اس لیے سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔اس مضمون کو صاحب کشاف نے بھی لکھا ہے۔اس لیے میں کہا کرتا ہوں کہ ضروری صرف ونحو اور کسی قدر ادب پڑھا کر قرآن شریف کا سادہ پڑھا دینا مناسب ہے کیونکہ کتب درسیہ کی تحصیل کے بعد دماغ میں اصطلاحات رچ جاتی ہیں،

پھر طالب علم قرآن شریف کو اسی طرز پر منطبق کرنے لگتا ہے۔ اس طرح قرآن شریف کا ترجمہ پڑھ کر پھر فنون ضرور پڑھے کیونکہ بعض مقامات قرآنیہ بغیر فنون کے حل نہیں ہوتے''

(کلام الحسن ص ۳۲)

اسی مسئلہ کو ایک اور انداز میں یوں بیان فرماتے ہیں:

''اہل مدارس طرز تعلیم میں کچھ ترمیم کریں۔ جیسے بعض متون بغیر شرح کے پڑھائی جاتی ہیں، اسی طرح جلالین سے پہلے قرآن مجید بھی بغیر کسی خاص تفسیر کے زبانی حل کے ساتھ پڑھایا جایا کرے۔ یا تو پورا قرآن پہلے پڑھا دیا جائے یا ایسا کریں کہ مثلاً ربع پارہ اول خالی قرآن کریم میں پڑھا دیا جائے، پھر اسی قدر جلالین پڑھا دی جائے اور مدرس اپنی سہولت کے لیے خواہ جلالین اپنے پاس رکھے یا اور کوئی مبسوط تفسیر تو طلبہ کو پڑھنے میں اسی طرح یاد کرنے کی اور مطالعہ کر کے حل کرنے کی عادت پڑ جائے گی'' (اصلاح انقلاب ص ۴۷)

جبکہ نصاب میں ضروری اضافوں کے حوالے سے حضرت تھانویؒ کا ارشاد گرامی یہ ہے:

''یہ میری بہت پرانی رائے ہے اور اب تو رائے دینے سے بھی طبیعت افسردہ ہوگئی اس لیے کہ کوئی عمل نہیں کرتا۔ وہ رائے یہ ہے کہ تعزیرات ہند کے قوانین اور ڈاک خانہ اور ریلوے کے قواعد بھی مدارس اسلامیہ کے درس میں داخل ہونے چاہییں۔ یہ بہت پرانی رائے ہے مگر کوئی مانتا اور سنتا ہی نہیں۔'' (الافاضات الیومیہ، جلد ششم، ص ۴۳۵)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہ العزیز کے ان ارشادات کو نقل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ دینی مدارس کے نصاب و نظام اور طرز تدریس دونوں میں تبدیلی اور وقت کی ضروریات کو ان میں سمونے کی ضرورت کا احساس بہت پرانا ہے اور اس کا اظہار بڑے بڑے اکابر نے کیا ہے، لیکن دوسری طرف مدارس کے ارباب حل وعقد کے جمود کی بھی داد دیجیے کہ حضرت تھانویؒ جیسے بزرگ کو بھی اس حسرت کے ساتھ سپرانداز ہونا پڑا ہے کہ ''کوئی مانتا اور سنتا ہی نہیں''۔

ہمارے دور میں اس مسئلہ پر سب سے زیادہ بحث حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری قدس اللہ سرہ العزیز نے کی ہے اور درجنوں مضامین و مقالات میں انہوں نے نصاب تعلیم اور طرز تدریس میں وقت کے تقاضوں کے مطابق تبدیلی کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ ان کا ارشاد ہے کہ

نصاب میں تین طرح کی تبدیلیوں کی ضرورت ہے:

۱۔تخفیف، یعنی بھاری بھرکم نصاب کو کچھ ہلکا کیا جائے اور ایک ہی فن میں درجنوں کتابیں الگ الگ پڑھانے کے بجائے تین چار اہم اور زیادہ مفید کتابوں کی تعلیم دی جائے۔

۲۔تیسیر، یعنی مشکل پسندی کا طریقہ ترک کر کے غیر متعلقہ مباحث میں طلبہ کے ذہنوں کو الجھانے کے بجائے نفس کتاب اور نفس مضمون کی تفہیم کو ترجیح دی جائے۔

۳۔اثبات وترمیم، یعنی غیر ضروری فنون کو حذف کر کے جدید اور مفید علوم کو شامل کیا جائے۔حضرت بنوریؒ نے اس سلسلہ میں جن نئے علوم کو نصاب میں شامل کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے، ان میں ۱۔تاریخ اسلام، ۲۔سیرت النبیؐ، ۳۔جدید عربی ادب وانشا، ۴۔جدید علم کلام، ۵۔ریاضی اور ۶۔معاشیات بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

اس مسئلہ پر حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ نے بھی بحث کی ہے اور انہوں نے ۲۲ فروری ۱۹۴۷ء کو لکھنؤ میں عربی مدارس کے نصاب کے بارے میں ایک کمیٹی کی صدارت کرتے ہوئے جو خطبہ ارشاد فرمایا، وہ ہمارے نصاب ونظام پر ایک جامع اور مکمل تبصرہ کی حیثیت رکھتا ہے اور اس موضوع سے دل چسپی رکھنے والے ہر شخص کو اس کا بار بار مطالعہ کرنا چاہیے۔یہ خطبہ صدارت ادارہ نشریات اسلام اردو بازار لاہور کے طبع کردہ ''خطبات آزاد'' میں موجود ہے اور ہم نے بھی ماہنامہ الشریعہ کے نومبر ۱۹۹۳ء کے شمارے میں اسے شائع کیا ہے۔اس مختصر مضمون میں اس کے تمام ضروری مباحث اور پہلوؤں کا تذکرہ تو ممکن نہیں ہے مگر دو اقتباسات ضرور پیش کرنا چاہوں گا تاکہ وقت کی ضروریات اور تقاضوں سے ہماری بے خبری بلکہ بے پروائی کا کچھ اندازہ ہو سکے۔

> ''حضرات! مجھے معاف کیا جائے۔۱۴ تا ۱۵ برس تک لڑکے پڑھتے ہیں اور دس سطریں عربی کی صلاحیت کے ساتھ نہیں لکھ سکتے۔اگر لکھیں گے تو ایسی عربی ہوگی جس کو ایک عرب نہ پہچان سکے گا۔تو یہ ایک بہت بڑا نقص ہے جو ہندوستان میں پیدا ہوا۔ضرورت ہے کہ عربی کی تعلیم کی نیو نئے سرے سے قائم کریں۔بہترین کتابیں موجود ہیں، بہترین مواد موجود ہے، ایسی کتابیں موجود ہیں کہ عربی ادب کے معجزات میں جن کا شمار ہو سکے۔''

اسی خطبہ میں مولانا آزادؒ فرماتے ہیں:

''میں نے بھی پھٹی ہوئی چٹائیوں پر بیٹھ کر انہی کتابوں کو پڑھا ہے اور میری ابتدائی تعلیم کا وہ سرمایہ ہیں۔ ایک منٹ کے لیے بھی میرے اندر مخالفت کا خیال نہیں پیدا ہو سکتا مگر میرا دل اس بارے میں زخمی ہے۔ یہ معاملہ تو ایسا تھا کہ آج سے ایک سو برس پہلے ہم نے اس چیز کو محسوس کیا ہوتا اور اس حقیقت کو تسلیم کیا ہوتا کہ اب دنیا کہاں سے کہاں آ گئی ہے اور اس کے بارے میں کیا تبدیلی ہمیں کرنا ہے، لیکن اگر سو برس پہلے ہم نے تبدیلی نہیں کی تو کم از کم یہ تبدیلی ہم کو پچاس برس پہلے کرنا چاہیے تھی۔ لیکن آج ۱۹۴۷ء میں اپنے مدرسوں میں جن چیزوں کو ہم معقولات کے نام پر پڑھا رہے ہیں، وہ وہی چیزیں ہیں جن سے دنیا کا دماغی کارواں دو سو برس پہلے گزر چکا۔ آج ان کی دنیا میں کوئی جگہ نہیں ہے۔''

الغرض دینی مدارس کی تمام تر خدمات، قربانیوں، ایثار اور تاریخی کردار کے باوجود آج کے دور کے تقاضوں اور ضروریات کے حوالے سے ان کے نصاب ونظام میں ضروری رد وبدل اور مناسب ترمیم واضافہ وقت کی ایک اہم ترین ضرورت ہے جس کی طرف اکابر علمائے حق ہر دور میں توجہ دلاتے چلے آ رہے ہیں اور ہماری گزارش بھی یہی ہے کہ وقت کے تقاضوں کو محسوس کیا جائے، دینی ضروریات کو سامنے رکھا جائے اور مستقبل کے امکانات وخطرات کا ادراک کرتے ہوئے باہمی مشاورت کے ساتھ جو تبدیلی بھی ناگزیر ہو، اسے اختیار کرنے میں تامل سے کام نہ لیا جائے۔ اس سلسلہ میں دینی مدارس کے سینئر اساتذہ اور دور حاضر کے مسائل وضروریات پر نظر رکھنے والے ارباب علم ودانش کے درمیان وسیع پیمانے پر مذاکروں اور مباحثوں کی ضرورت ہے۔ ایک دوسرے کے نقطہ نظر کو سنجیدگی کے ساتھ سننے اور اس کی روشنی میں تمام پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہوئے قدم بڑھانے کی ضرورت ہے۔ خدا کرے کہ ہمارے ارباب مدارس اس ضرورت کا جلد احساس کریں اور اسے پورا کرنے کے لیے حوصلہ اور جرات کے ساتھ پیش رفت کر سکیں، آمین۔

(ماہنامہ الشریعہ، اپریل ۲۰۰۱)

فکری ومسلکی تربیت کے چند ضروری پہلو

[۵؍دسمبر ۲۰۰۳ء کو الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں
اساتذہ کے ایک مشاورتی اجتماع سے خطاب]

بعد الحمد والصلوۃ۔

اس نشست میں میری گفتگو کا عنوان ہے: ''فکری ومسلکی تربیت کے چند ضروری پہلو''۔ فکری تربیت سے مراد یہ ہے کہ دینی مدارس کے طلبہ جب ایک خاص نصاب کی تعلیم پا کر سوسائٹی میں جاتے ہیں اور انہیں آج کے مسائل اور حالات سے سابقہ پیش آتا ہے تو ان کی فکر اور سوچ کیا ہو؟ ان کا نصب العین اور زندگی کا مقصد کیا ہو؟ ہر آدمی کا کوئی نہ کوئی فکری نصب العین بن جاتا ہے جس کے اردگرد اس کی زندگی کی ساری تگ ودو گھومتی ہے۔ طالب علمی کے دوران میں اس کے ذہن میں کوئی نہ کوئی ترجیح قائم ہو جاتی ہے کہ میں نے تو یہ کام کرنا ہے، اور پھر وہ ساری زندگی اسی میں لگا رہتا ہے۔ یہ مرحلہ یعنی کسی طالب علم کی فکری تربیت کے رخ کا تعین، ہم نے اسے آزاد چھوڑا ہوا ہے اور طالب علم اپنی مرضی سے اس کا تعین کر رہے ہیں۔ اس کا تعلق بھی اس بات سے ہے جو اساتذہ کی تربیت کے حوالے سے ہماری مشاورت میں زیر غور آئی، یعنی چونکہ ہمارے ہاں اساتذہ کی تربیت کا کوئی نظم موجود نہیں، اس لیے ہوتا یہ ہے کہ مدارس میں اساتذہ میں سے جس استاذ کے ساتھ طالب علم زیادہ مانوس ہو جاتا ہے، تو جو ذہنی سوچ اس کی ہوتی ہے، وہی طالب علم کی بھی بن جاتی ہے۔ ایک مدرسے میں اساتذہ کے ذہنی رجحانات مختلف ہیں تو دو دو، چار چار طالب علم ان میں سے ہر ایک کے ساتھ مانوس ہو جاتے ہیں۔ اس طرح فکری تربیت تو ہوتی ہے

لیکن یہ فکر کوئی اجتماعی فکر نہیں ہوتی۔ ہر طالب علم اپنے ذوق کے مطابق کسی استاد کے ساتھ منسلک ہو جاتا ہے اور اسی کے مطابق اس کی ذہنی وفکری تربیت ہوتی ہے اور وہ اسی سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ میں اس کو خون کے گروپ سے تعبیر کیا کرتا ہوں۔ ہمارے ہاں خون کے مختلف گروپ کام کر رہے ہیں۔ سپاہ صحابہ کا خون گروپ ہے، جہادی خون گروپ ہے، جمعیت علمائے اسلام کا خون گروپ ہے۔ اسی طرح تبلیغی جماعت، اشاعت التوحید اور خدام اہل سنت کے خون گروپ موجود ہیں۔ ان میں سے کچھ گروپ آپس میں ملتے ہیں اور کچھ نہیں ملتے۔ اور لطیفے کی بات یہ ہے کہ اتفاق سے میرا خون کا گروپ سب سے مل جاتا ہے۔ میرا خون سب کو لگ جاتا ہے اور سارے خون اس کو لگ جاتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ طالب علم کو مجموعی فکر ہم نے کیا دی ہے؟ میں وفاق والوں سے اکثر عرض کیا کرتا ہوں کہ آپ اساتذہ کی تربیت کا اہتمام کریں تاکہ وہ طلبہ کا کوئی اجتماعی ذہن تو بنائیں اور انہیں کوئی بنیادی سوچ تو دیں۔ یہ تو انہیں بتائیں کہ ملک وملت کے تقاضے کیا ہیں، عالمی صورت حال کے تقاضے کیا ہیں، اور آپ کے مسلک کے بنیادی تقاضے کیا ہیں۔ انہیں کوئی اجتماعی سوچ دیں، اس کے ساتھ ساتھ ضمنی ترجیحات کا دائرہ بھی موجود رہے۔

آپ تقریباً اتفاق کریں گے کہ صورت حال ایسی ہی ہے اور اس کی بنیادی وجہ ہے کہ اساتذہ، جنہوں نے سوچ دینی ہے اور فکری تربیت کرنی ہے، خود ان کی اپنی اجتماعی فکر کا کوئی اہتمام نہیں۔ عصری تعلیم میں ہر سطح کے اساتذہ کے لیے اس سطح کا تربیتی کورس کرنا ضروری ہے لیکن ہمارے ہاں اس کا کوئی نظم نہیں۔

آج صورت حال یہ ہے کہ فکری طور پر ہم خلفشار کا شکار ہیں۔ ہم پر مغرب کی فکری اور تہذیبی یلغار ہے۔ اس کی صحیح تعبیر وہ ہے جو ہمارے شیخ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے کی ہے کہ 'ردة ولا ابابکر لها'۔ یہ فکری ارتداد کا زمانہ ہے۔ آپ ذرا محدود حلقے میں ہیں، اللہ آپ کے ایمان کو سلامت رکھے، لیکن اگر آپ جدید حلقے میں چلے جائیں، کسی کے ذہن کو ٹٹولیں تو احتراماً اور عقیدتاً یا فتوے کے ڈر سے تو وہ شاید کوئی بات نہ کہے لیکن جب آپ اس کی فکر کا تجزیہ

کریں گے تو کہیں نہ کہیں ارتداد، ارتیاب اور شک کا کوئی نہ کوئی پہلو موجود ہوگا۔ کسی نہ کسی حوالے سے وہ آج کی فکری ارتداد کی لہر سے متاثر ہوگا۔

ہمارے ہاں مسئلہ یہ ہے کہ ہم اس کشمکش کو سرے سے سمجھ ہی نہیں رہے۔ ہم پر دباؤ بڑھتا جا رہا ہے، ہمارے گرد حصار تنگ ہوتا جا رہا ہے اور ہم بالکل ایک دائرے میں محصور ہوتے جا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک جدید تعلیم یافتہ نوجوان آپ سے گفتگو کرتا ہے۔ اس کے ذہن میں نکاح وطلاق یا دوسرے مسائل کے بارے میں شریعت کے احکام کے بارے میں شک ہے۔ اس نے جدید لٹریچر پڑھا ہوا ہے۔ ہم اس کے شک اور اس کی وجہ کو سمجھ کر شک کا کانٹا نکالنے کے بجائے اس کے ساتھ طعنے اور فتوے کی زبان میں بات کرتے ہیں۔ وہ ہمارے سامنے تو احتراماً خاموش ہو جاتا ہے لیکن اس کا شک پہلے سے زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے کہ کوئی بات ضرور ہے، اس لیے یہ جواب نہیں دے سکے اور مجھے ڈانٹ رہے ہیں۔ ہم سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ اس کو شک کیا ہوا ہے، اس لیے کہ خود ہمیں معلوم نہیں ہے کہ اس کے پس منظر میں کون سا فکری الجھاؤ کارفرما ہے۔

بات سمجھانے کے لیے ایک حوالہ دوں گا۔ میں ایک عرصے سے مدارس کے منتظمین سے گزارش کر رہا ہوں کہ آج کا بین الاقوامی قانون جو رائج الوقت ہے، جس کی بنیاد پر ہم پر اعتراضات ہوتے ہیں اور الزام لگایا جاتا ہے، وہ اقوام متحدہ کا انسانی حقوق کا چارٹر ہے۔ اس کی تیس دفعات ہیں۔ ہم نے اس کو تسلیم کر رکھا ہے اور اس پر دستخط کر رکھے ہیں۔ اس وقت عالمی کشمکش میں ایک جھگڑا یہ ہے کہ مغربی اقوام کا موقف یہ ہے کہ جب آپ نے اس چارٹر پر دستخط کر رکھے ہیں، اس کے نظام میں شریک ہیں، اس سے فائدے اٹھاتے ہیں، یہ ایک بین الاقوامی معاہدہ ہے جس کے آپ رکن ہیں، آپ نے یہ عہد کیا ہے کہ اس میں لکھی ہوئی باتوں کی اپنے دستور میں پابندی کریں گے، تو آپ اس کے خلاف اقدامات کیوں کر رہے ہیں؟ یہ موقف اس حوالے سے درست ہے کہ جب ہم نے باقاعدہ معاہدہ کر رکھا ہے تو یا تو اس پر عمل کریں یا اس سے پیچھے ہٹ جائیں۔

دوسری طرف ہماری صورت حال یہ ہے کہ اگر اس چارٹر کو اور اس کی ان تشریحات کو قبول کر

لیا جائے جو اقوام متحدہ کے باضابطہ ادارے مثلاً جنیوا انسانی حقوق کمیشن، یونیسکو اور یونیسف وغیرہ کرتے ہیں، تو ہمیں احکام شرعیہ میں سے کم از کم ۸۰ فیصد سے دستبردار ہونا ہوگا۔ مثلاً اس میں لکھا ہے کہ مرد اور عورت کے درمیان مساوات کو یقینی بنایا جائے اور جنس کی بنیاد پر کوئی امتیازی قانون نہ بنایا جائے۔ مرد اور عورت کے مابین تمام معاملات میں مساوات ضروری ہے۔ اب آپ اپنے قوانین کو دیکھ لیں کہ مرد اور عورت کے لیے قوانین میں کہاں کہاں فرق نہیں ہے۔ نماز سے شروع ہو جائیں۔ عائلی قوانین کو دیکھ لیں۔ آپ مرد کو طلاق کا حق دیتے ہیں، عورت کو نہیں دیتے۔ یہ امتیازی قانون ہے۔ وراثت میں آپ مرد کو حصہ زیادہ دیتے ہیں، عورت کو کم دیتے ہیں۔ یہ امتیازی قانون ہے۔ شہادت میں آپ بعض معاملات میں عورتوں کی گواہی قبول نہیں کرتے۔ یہ امتیاز کا قانون ہے۔ عورت کو آپ صدر اور وزیر اعظم بننے کا حق نہیں دیتے۔ یہ امتیاز کا قانون ہے۔ اس طرح آپ کی فقہ میں بہت سے ایسے احکام نکلیں گے جہاں آپ امتیاز کے قانون پر عمل کر رہے ہیں جو کہ اقوام متحدہ کے چارٹر کے خلاف ہے اور اس پر فوراً کہا جائے گا کہ آپ اس کو منسوخ کریں۔

ایک دوسری مثال لیں۔ عالمی قانون میں آزادی رائے اور تبدیلی مذہب کا حق ہر شخص کو حاصل ہے۔ ہر شخص کو کوئی بھی مذہب چھوڑنے یا اختیار کرنے کا اور کسی بھی قسم کی رائے ظاہر کرنے کا حق ہے۔ لیکن ہم نے توہین رسالت پر موت کی سزا کا قانون نافذ کر رکھا ہے جو رائے کی آزادی کے خلاف ہے۔ ہم نے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا ہے، ان کو مسجدیں نہیں بنانے دیتے، ان کو اسلامی اصطلاحات استعمال نہیں کرنے دیتے جو مذہبی آزادی کے خلاف ہے۔

یا مثلاً بین الاقوامی قانون میں غلامی کی تمام صورتیں ممنوع ہیں۔ ہم بھی کہتے ہیں کہ غلامی اسلام کی مطلوبہ چیزوں میں سے نہیں، اس لیے بین الاقوامی معاہدے کے تحت یہ ممنوع سہی، لیکن وہ کہتے ہیں کہ جب ممنوع ہے اور آپ مانتے ہیں کہ غلامی درست نہیں تو پھر پڑھاتے کیوں ہیں؟ تعلیمی نصاب سے خارج کیوں نہیں کرتے؟ قرآن پاک سے وہ آیات اور حدیث وفقہ سے وہ ابواب خارج کیوں نہیں کرتے؟

اسی طرح اس میں ایک دفعہ ہے کہ کوئی سزا ایسی نافذ نہیں کی جائے گی جس میں جسمانی تشدد یا ذہنی اذیت ہو یا جس میں توہین وتذلیل ہو۔ یعنی سزا کو تین چیزوں، جسمانی تشدد، ذہنی اذیت اور توہین وتذلیل سے خالی ہونا چاہیے۔ اب آپ کی کون سی سزا اس سے خالی ہے؟ آپ کی ساری حدود میں تشدد ہے، ہاتھ پاؤں کاٹنا، سنگسار کرنا، کوڑے مارنا، کھلے بندوں سزا دینا ہے جس میں توہین اور تذلیل ہے۔ گویا حدود کا نظام لے لیں، خاندانی نظام لے لیں، وراثت کا نظام لے لیں، نکاح وطلاق کا مسئلہ لے لیں، ہمارا کوئی بھی مسئلہ نہیں بچتا جس پر اعتراض نہ ہو۔

میرے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انسانی حقوق کے عالمی چارٹر کی ان تیس دفعات کو ہمارے ہاں نصاب میں پڑھایا جانا چاہیے، اس حوالے سے کہ آج کا مروجہ بین الاقوامی قانون کیا ہے، ہمارے قوانین کیا ہیں، ٹکراؤ کہاں ہے، ان کا موقف کیا ہے اور ہمارا موقف کیا ہے؟ ہمارے عالم دین کو پتہ تو ہونا چاہیے۔ جب کوئی اعتراض سامنے آئے تو وہ سمجھ تو سکے کہ اعتراض کیوں ہے؟ یہ ایک الگ بحث ہے کہ ہم نے ان کی کون سی بات قبول کرنی ہے اور کون سی نہیں، لیکن کم از کم ہمارے علماء کو اس جھگڑے سے واقف تو ہونا چاہیے۔ ہمارے ہاں سرے سے اس کا کوئی پتہ نہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب بحث کو اپنے دائرے میں محدود رکھتے ہیں تو اپنے لوگوں کو تو مطمئن کر لیں گے لیکن جب بات جدید تعلیم یافتہ ماحول میں کریں گے تو ہماری بات سنی نہیں جائے گی کیونکہ ہماری بات ادھوری اور بے علمی پر مبنی ہوگی۔

تو فکری تربیت سے مراد یہ ہے کہ ہمارے علماء کو یہ پتہ ہو کہ آج کا عالمی ماحول کیا ہے، ہماری کشمکش کس سے ہے، لڑائی کس سے ہے، اس کے مقابلے میں ہم نے کیا تیاری کی ہے؟ اس انداز سے ہم قرآن مجید کا مطالعہ کریں، احادیث کا مطالعہ کریں۔ سارا ذخیرہ موجود ہے۔ قرآن پاک میں ہر چیز موجود ہے، احادیث کے ذخیرے میں ہر بات کا جواب موجود ہے، البتہ فقہی کتابوں میں اس کی نئی تعبیرات کرنے کی ضرورت ہے، لیکن چونکہ ہماری اپنی اس انداز سے مطالعہ کرنے کی تربیت نہیں ہے، اس لیے آج کی اس فکری کشمکش میں ہم موثر طور پر حصہ لینے اور کوئی عملی کردار ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں بھی پہلے بات اساتذہ کی

آئے گی۔ استاد کو پتہ ہوگا تو وہ شاگرد کو بتائے گا۔ اگر اسے خود پتہ نہیں ہوگا تو شاگردوں کو کیا بتائے گا؟ میں نے وفاق والوں سے گزارش کی تھی کہ آج کے مغربی فلسفہ، عالمی کشمکش اور تہذیبی جنگ پر اساتذہ کے لیے بریفنگ کورس کا اہتمام کریں اور نصاب میں بھی ایسی چیزیں شامل کریں، خواہ وہ محاضرات کی شکل میں ہوں یا کسی کتاب کی صورت میں۔ ہمارے ہاں اس موضوع پر کام نہیں ہو رہا لیکن عرب دنیا میں کافی کام ہو رہا ہے۔ اس میں سے اچھا مواد مل جائے گا۔

اس کے بعد دوسرا مسئلہ ہے مسلکی تربیت کا۔ ہمارا مسلک کیا ہے اور دیوبندیت کیا ہے؟ یہاں میں تھوڑی سی گستاخی کروں گا جس کے لیے مجھے معاف کر دیں۔ میری عادت یہ ہے کہ جو بات سمجھ میں آتی ہے، کہہ دیا کرتا ہوں۔ اگر ناراض نہ ہوں تو ایک کہاوت عرض کرتا ہوں۔ کہتے کہ چار پانچ نابینا کہیں اکٹھے ہو گئے اور آپس میں باتیں کرنے لگے کہ ہاتھی کیسا ہوتا ہے۔ طے یہ ہوا کہ اس کا فیصلہ 'مشاہدہ' کرنے کے بعد کیا جائے۔ اب وہ گئے اور جا کر ہاتھی کو ٹٹولنے لگے۔ دیکھا تو تھا نہیں، تو کسی کے ہاتھ کان پر آ گئے، کسی کے سونڈ پر اور کسی کے سینگ پر۔ اب وہ تبصرہ کر رہے ہیں کہ ہاتھی کیسا ہوتا ہے؟ ایک نے کہا کہ ہاتھی لمبا سا ہڈی کا سینگ ہوتا ہے۔ دوسرے نے کہا کہ نہیں وہ تو چھاج کی طرح لمبا اور چوڑا سا ہوتا ہے۔ تیسرے نے کہا کہ پانی کا ایک نل ہے جس کو ہاتھی کہتے ہیں۔ چوتھے نے کہا کہ چمڑے کے ایک بڑے سے ستون کو ہاتھی کہا جاتا ہے۔

ہمارا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ ہم میں سے جس شخص کو جس ماحول میں جس سے واسطہ پڑ جاتا ہے، ہماری دیوبندیت اسی تک محدود ہو جاتی ہے۔ ایک ماحول میں شیعہ سے واسطہ ہے تو دیوبندیت یہی ہے کہ ان کا مقابلہ کیا جائے۔ ہماری دیوبندیت اس دائرے میں بند ہو جاتی ہے۔ کہیں اہل حدیث سے سابقہ پیش آ جائے تو وہاں دیوبندیت صرف حنفیت کے دفاع میں محصور ہو جاتی ہے، باقی سارے تقاضے ختم ہو جاتے ہیں۔ کہیں بریلویوں سے لڑائی آ گئی ہے تو دیوبندیت اس دائرے میں بند ہو جاتی ہے۔ میں ان مسائل سے انکار نہیں کر رہا۔ یہ تمام شعبے ہیں۔ مجھے نہ حنفیت کے دفاع کی اہمیت سے انکار ہے، نہ بریلویت کے مقابلے سے اور نہ انکار حدیث اور شیعہ کا جواب دینے سے، لیکن یہ تمام جزوی شعبے ہیں۔ ہم ان الگ الگ شعبوں کی بات تو کرتے ہیں

لیکن بدقسمتی سے اہل السنّت والجماعت کا جو اجتماعی دھارا چلا آ رہا ہے، اس کی بات ہم میں سے کوئی نہیں کرتا۔

قیام دیوبند کا اصل مقصد کیا تھا؟ جب انگریز یہاں آیا تھا اور اس کے ہاتھوں دین مٹ رہا تھا تو کچھ اللہ والوں نے اس تحریک کی بنیاد رکھی کہ دین کو جس حد تک ممکن ہو، بچا لیا جائے۔ مجموعی دین کو، اس کے اجتماعی حصے کو اور سب شعبوں کو بھی۔ میرے نزدیک دیوبندیت تین چیزوں کا نام ہے۔ اگر دیوبندیت میں کسی کو معیار سمجھا جائے تو میرے نزدیک سب سے بڑا معیار شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمہ اللہ تعالیٰ ہیں جن کو بطور نمونہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان میں وہ تینوں باتیں تھیں: علم بھی بدرجہ اتم، روحانیت بھی بدرجہ اتم، اور جہاد بھی بدرجہ اتم۔ گویا دیوبندیت یہ ہے کہ علم میں بھی کمال ہو، روحانیت میں بھی کمال ہو اور ملی غیرت اور جہاد کے جذبے میں بھی کمال ہو۔

دیوبندی مسلک کوئی نیا مسلک نہیں ہے۔ ہم عقائد کے لحاظ سے اہل سنت ہیں اور فقہی اعتبار سے حنفی ہیں۔ کوئی نیا تشخص ہم نے قائم نہیں کیا۔ ایک مدرسے کے ساتھ ہماری نسبت ہے، جس کے اجتماعی مقاصد کے حوالے سے میں عرض کیا کرتا ہوں کہ ہمارے اکابر نے ضمنی طور پر سارے کام کیے۔ حضرت شیخ الہند کو لے لیں۔ کیا انہوں نے حنفیت کا دفاع نہیں کیا؟ ان کے اس پر رسالے موجود ہیں، لیکن اس حد تک جتنی ضرورت پڑی۔ حضرت مدنی رحمہ اللہ نے 'الشہاب الثاقب' لکھی، لیکن یہ کام ضرورت کی حد تک محدود رہا۔ ان کا اصل مقصد ملی وجود اور ملی مقاصد تھے۔ جہاں ضرورت پڑی، ضمنی اور فروعی مسائل سے بھی تعرض کیا، لیکن اس کے لیے اپنے آپ کو وقف نہیں کر دیا۔ میں بھی یہی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دیوبندیت سے مراد اگر ہم نے الگ الگ شعبے لے رکھے ہیں تو میں اس کو دیوبندیت نہیں سمجھتا۔ دیوبندیت نام ہے ملت کے اجتماعی دینی کام کا۔ جہاں کسی ضمنی کام کی ضرورت پڑتی ہے، وہاں وہ ضرور کیا جائے لیکن ہمارا اجتماعی اور مین دھارا یہ ہے کہ اس ملک میں، اس معاشرے میں دین کی اجتماعی حفاظت کی جائے اور نئی نسل تک دین صحیح حالت میں منتقل ہو۔ اجتماعی مقاصد اور ملی مقاصد کے حوالے سے ہم طلبہ کی تربیت کریں۔

ہمیں اس پہلو کی طرف توجہ دینی چاہیے کہ فکری تربیت، ملکی مقاصد اور مسلک کے اصل

اہداف کے حوالے سے ہمیں تھوڑا سا ماضی کی طرف پلٹ کر اپنے بزرگوں کو دیکھیں اور اس کے مطابق علمی کمال، روحانیت اور ملی غیرت وحمیت کی خصوصیات اپنے طلبہ میں پیدا کر کے اجتماعی مقاصد اور ضروریات کے لیے ان کو تیار کریں۔

باتیں تو میں اور بھی بہت سی کہنا چاہتا تھا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وقت اس کی اجازت نہیں دیتا۔ پھر کبھی موقع ملا تو ان شاء اللہ ان پر تفصیل سے بات ہوگی۔ اس وقت میں چاہوں گا کہ مولانا محمد بشیر صاحب سیالکوٹی آپ حضرات کے ساتھ عربی زبان کی تعلیم وتدریس کے جدید اسلوب اور اس کی اہمیت کے موضوع پر تفصیل کے ساتھ گفتگو فرمائیں۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

(ماہنامہ الشریعہ، جنوری/فروری ۲۰۰۴)

ائمہ مساجد اور علمائے کرام کی معاشرتی ذمہ داریاں

بنگلہ دیش میں ضلع سونام گنج کے ایک قصبہ دیرائی میں ۸/جنوری ۲۰۰۴ء کو ائمہ وعلماء کانفرنس کے عنوان سے اجتماع تھا۔لندن میں بنگلہ دیش سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کے دینی مرکز ''المرکز الاسلامی'' کے مدیر مولانا محمد شعیب اس کے منتظم تھے۔مولانا محمد عیسیٰ منصوری اور مولانا محمد فاروق ملا کے ہمراہ وہاں پہنچا تو علمائے کرام نے بڑی محبت کا اظہار کیا۔استقبال کرنے والوں میں مولانا نورالاسلام خان بھی شامل تھے جو دیکھتے ہی چمٹ گئے اور کان میں کہا کہ میں نصرۃ العلوم کا فاضل ہوں، میں نے ۱۳۹۱ھ میں دورۂ حدیث کیا تھا۔ مجھے بھی بہت خوشی ہوئی۔ایک دوسرے سے حال احوال دریافت کیا۔ پتہ چلا کہ دارالعلوم درگار پور میں شیخ الحدیث ہیں اور ایک عرصے سے تدریسی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔درگار پور واپسی پر راستہ میں تھا۔تھوڑی دیر کے لیے دارالعلوم میں رکے اور دارالعلوم کے مہتمم حضرت مولانا عبدالحق دامت برکاتہم کی زیارت کی جو شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کے خلفا میں سے ہیں۔ائمہ وعلماء کانفرنس ایک ہال میں تھی جس میں علاقہ بھر کے علمائے کرام اور ائمہ کرام کی ایک بڑی تعداد شریک تھی۔کانفرنس کا مقصد علماء اور ائمہ کو ان کی معاشرتی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلانا تھا۔راقم الحروف نے جو گزارشات پیش کیں، ان کا خلاصہ درج ذیل ہے:

علمائے کرام کے بارے میں ایک حدیث نبوی کی بنیاد پر یہ کہا جاتا ہے کہ وہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کے وارث ہیں جبکہ ائمہ جس مصلے پر کھڑے ہو کر نماز پڑھاتے ہیں، اسے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مصلیٰ سمجھا جاتا ہے اور جس منبر پر خطبہ دیتے ہیں، اسے منبر رسول

کے عنوان سے پکارا جاتا ہے۔اس حوالے سے علماء اور ائمہ اس معاشرہ میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت اور نمائندگی کے منصب پر فائز ہیں اور ہمیں اس منصب کی ذمہ داریوں اور تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے یہ جائزہ لینا چاہیے کہ ہم ان ذمہ داریوں کو کہاں تک ادا کر رہے ہیں؟ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مختلف حیثیات میں سے اس وقت تین چار امتیازی حیثیات کا تذکرہ کرنا چاہوں گا تاکہ ہم یہ دیکھ سکیں کہ ان حیثیات میں ہم لوگ جو علمائے کرام کہلاتے ہیں اور امامت کے منصب پر فائز ہیں، اپنے فرائض کی انجام دہی میں کہاں تک کامیاب ہیں؟

احادیث نبوی کے مطابق غار حرا میں پہلی وحی کے نزول کے بعد جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جو سب سے پہلا تعارف روایات میں ملتا ہے، ام المومنین حضرت خدیجہ الکبریٰ کی زبان سے ہے جس میں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اور حوصلہ دیتے ہوئے ان کا وہ معاشرتی رول اور کردار یاد دلایا ہے جسے ایک سوشل ورکر کا کردار کہا جاتا ہے۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غار حرا میں پہلی وحی کے اچانک واقعہ کی وجہ سے گھبراہٹ کا شکار تھے جس پر ام المومنین حضرت خدیجہؓ نے کہا کہ آپ گھبرائیں نہیں، اس لیے کہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، بے سہارا لوگوں کا سہارا بنتے ہیں، بیواؤں کے کام آتے ہیں، محتاجوں کی مدد کرتے ہیں اور مہمانوں کی خدمت کرتے ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ آپ کو ہرگز ضائع نہیں ہونے دیں گے۔

غار حرا کی وحی کے بعد ہمیں احادیث نبوی میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا تعارف یہی ملتا ہے اور ہمیں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت اور نمائندگی کی بات کرتے ہوئے اس بات کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لینا چاہیے کہ اس حیثیت سے ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا نمائندگی کر رہے ہیں؟

اس کے بعد جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسرا تعارف ایک داعی اور مصلح کا ہے۔ آپ نے لوگوں کو توحید کی طرف دعوت دی اور معاشرہ میں ہر طرف پھیلی ہوئی ان برائیوں کے خلاف آواز بلند کی جن کی وجہ سے وہ معاشرہ جاہلی معاشرہ کہلاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے اقرار اور اس کی بندگی کی دعوت تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی دعوت تھی، لیکن اس

کے ساتھ آپ نے عرب معاشرے کو جن باتوں کی طرف توجہ دلائی، ان کا تذکرہ قیصر روم کے دربار میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس وقت کے سب سے بڑے حریف حضرت ابوسفیانؓ نے ان الفاظ سے کیا تھا کہ وہ ہمیں صدق، صلہ اور عفاف کا حکم دیتے ہیں۔ ابوسفیانؓ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے بلکہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف قریش کی قیادت کر رہے تھے، لیکن انہیں دنیا کے ایک بڑے بادشاہ کے دربار میں یہ کہنا پڑا کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا ایک بڑا حصہ یہ ہے کہ لوگ سچ بولیں، آپس کے تعلقات اور روابط کو قائم رکھیں اور پاک دامنی اختیار کریں۔ عرب معاشرے میں اس وقت پھیلی ہوئی باہمی رقابتوں، بدکاری اور جھوٹ کے ماحول میں یہ معاشرتی اصلاح کی بہت بڑی دعوت تھی جس سے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عرب معاشرہ میں ایک عظیم داعی اور مصلح کے طور پر سامنے آئے۔ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نمائندگی اور نیابت کا دعویٰ کرتے ہوئے یہ بھی سوچنا ہوگا کہ جس معاشرہ میں ہم رہ رہے ہیں، اس میں داعی اور مصلح کے طور پر ہمارا کردار کیا ہے اور غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دینے، نیز معاشرتی برائیوں سے سوسائٹی کو نجات دلانے کے لیے ہم کیا کر رہے ہیں؟

اس کے بعد جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم کردار کا ایک اور رخ سامنے آتا ہے اور وہ ان کی معلم کی حیثیت ہے جسے قرآن کریم نے کئی جگہ بیان کیا ہے اور خود جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اردگرد رہنے والوں کو اور اپنے پاس آنے والوں کو براہ راست اور ان کے ذریعے سے مختلف اطراف کے لوگوں کو جن باتوں کی تعلیم دی، ان کا دائرہ بہت متنوع اور وسیع ہے۔ میں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ آپ علمائے کرام ہیں، خوب جانتے ہیں۔ البتہ میں اس طرف ضرور توجہ دلانا چاہوں گا کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معلم کے کردار کو سامنے رکھ کر ہم اپنے طرز عمل کا جائزہ لیں کہ جس ماحول میں ہم رہتے ہیں، وہاں کے اردگرد کے لوگوں کے ساتھ ایک معلم کی حیثیت سے ہمارا کیا رابطہ ہے؟

اگر گستاخی معاف فرمائیں تو میں عرض کرنا چاہوں گا کہ جو لوگ مسجد میں ہمارے پاس

آجاتے ہیں اور مدرسہ میں ہم سے تعلیم حاصل کرنے کے لیے جمع ہوجاتے ہیں، ان پر تھوڑی بہت محنت کر کے ہم مطمئن ہیں کہ ہم اپنا فرض ادا کر رہے ہیں۔ ہم نے ان افراد پر قناعت کر لی ہے اور ان کے علاوہ باقی لوگوں سے رابطہ اور تعلق کی ہمیں کوئی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی۔ میری درخواست ہے کہ مسجد اور مدرسہ میں ہمارے پاس آنے والوں کا معاشرہ کے باقی افراد کے ساتھ عددی تناسب ہمیں ضرور معلوم کرنا چاہیے اور پھر یہ دیکھنا چاہیے کہ ہمارے ماحول اور آبادی کی وہ عظیم اکثریت جس کا ہمارے ساتھ مسجد یا مدرسہ کا کوئی رابطہ نہیں ہے، اس کے ساتھ ایک مصلح اور معلم کے طور پر ہمارا کیا معاملہ ہے؟ یہ بات سنجیدگی کے ساتھ سوچنے کی ہے، ورنہ ہوسکتا ہے کہ قیامت کے روز یہی لوگ ہمارا گریبان پکڑ لیں کہ ہماری اصلاح اور تعلیم کے لیے ان لوگوں نے ہمارے ساتھ کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاشرتی کردار کی اور بھی بہت سی حیثیات ہیں۔ آپ حکمران بھی تھے، کمانڈر بھی تھے اور قاضی بھی تھے، لیکن میں سرِ دست سوشل ورکر، داعی، مصلح اور معلم کی حیثیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے علمائے کرام اور ائمہ عظام کو غور وفکر کی دعوت دینا چاہتا ہوں کہ ان معاملات میں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا نیابت کر رہے ہیں اور ان کے وارث ہونے کا حق کہاں تک ادا کر رہے ہیں؟ معاف کیجیے! ہم نے صرف نماز پڑھا دینے اور اپنے پاس آجانے والوں کو تھوڑی بہت تعلیم دینے پر قناعت کر لی ہے اور اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت، نیابت اور نمائندگی سمجھ لیا ہے۔ یہ بات درست نہیں ہے اور ہمیں اس حوالے سے اپنے کردار، طرز عمل اور ترجیحات کا از سر نو جائزہ لینا چاہیے۔

دوسری بات جس کی طرف ائمہ اور علماء کی اس کانفرنس کے شرکا کو توجہ دلانا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ ہمیں اپنے احتساب اور اپنی سرگرمیوں کے ناقدانہ جائزہ کی ضرورت محسوس کرنی چاہیے۔ ہمارے ہاں اس بات کو نہ صرف غیر ضروری سمجھا جاتا ہے بلکہ معیوب قرار دیا جاتا ہے۔ یہ طرز عمل صحیح نہیں ہے۔ بعض دوست جب یہ بات کرتے ہیں کہ طالبان ہمارے بھائی ہیں، بہت نیک ہیں، مخلص ہیں اور انہوں نے قربانی اور ایثار کی شاندار روایات زندہ کی ہیں، اس لیے ان کی

غلطیاں نہیں نکالنی چاہئیں اور ان کے طرز عمل کا ناقدانہ جائزہ نہیں لینا چاہیے تو مجھے تعجب ہوتا ہے اور میں عرض کرتا ہوں کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سب سے بہترین اور مقدس طبقہ صحابہ کرام کا گروہ ہے، لیکن جب انہیں غزوہ احد میں وقتی طور پر ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا اور حنین کی لڑائی میں تھوڑی دیر کے لیے ان کے قدم اکھڑے تو قرآن کریم نے وضاحت کے ساتھ اس کا ذکر کیا اور ان کی ناکامی کا اعتراف کیا، اس کے اسباب بیان کیے اور ان وجوہ کی نشان دہی کی جن کی وجہ سے انہیں ان دونوں غزووں میں وقتی طور پر ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس سے حضرات صحابہ کرامؓ کے تقدس اور بزرگی میں کوئی فرق نہیں پڑا اور ان کے خلوص اور قربانیوں میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی، اس لیے قرآن کریم کا اسلوب اور ہدایت ہمارے لیے یہی ہے کہ اگر کسی مرحلہ میں ناکامی ہو تو اس کے اسباب کا جائزہ لو اور وجوہات کی نشاندہی کرو تاکہ ان کے ازالہ کے لیے کوئی صورت نکال سکو۔

اس پس منظر میں آج کی اس ائمہ وعلماء کانفرنس کی وساطت سے میں علمائے کرام اور ائمہ عظام کو یہ پیغام دینا چاہتا ہوں کہ وہ کسی بھی جگہ دینی خدمات سرانجام دے رہے ہوں، دو باتوں کا ہر وقت خیال رکھیں۔ ایک یہ کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وارث کہلاتے ہوئے اور آپ کے مصلے پر کھڑے ہو کر آپ کی نمائندگی کا دعویٰ کرتے ہوئے ہمیں اس بات کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ انسانی معاشرے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف حیثیات سے جو عظیم کردار ادا کیا تھا، ہم ان میں سے کس حیثیت کی نمائندگی کر رہے ہیں اور دوسری بات یہ کہ ہم اس وقت ہر محاذ اور ہر شعبہ میں جس پسپائی کا مسلسل شکار ہو رہے ہیں، اس کے اسباب اور وجوہات کیا ہیں؟ کیونکہ اسی صورت میں ہم انبیاے کرام علیہم السلام کے ورثا کی حیثیت سے اپنے کردار کو بہتر بنا سکتے ہیں اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں سرخرو ہو سکتے ہیں۔

(روزنامہ اسلام، ۲۶ جنوری ۲۰۰۴ء)

دینی تعلیم کے مختصر کورسز۔ضرورت واہمیت

کچھ برسوں سے مختلف شہروں میں اسکولوں اور کالجوں کی سالانہ تعطیلات سے فائدہ اٹھانے کا خوش آئند رجحان بڑھ رہا ہے اور بہت سے ادارے ان چھٹیوں میں اس طرح کے تعلیمی پروگرام کر رہے ہیں۔خود ہماری الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ میں اکادمی کے ناظم مولانا حافظ محمد یوسف نے اس سال ایک نئے تجربے کا آغاز کیا ہے۔وہ اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ میں درس نظامی کی تعلیم کا خصوصی ذوق رکھتے ہیں اور اس حوالے سے کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔بہت سے طلبہ نے ان کے اس ذوق سے استفادہ کیا ہے اور ایف اے اور بی اے کے امتحانات کے ساتھ ساتھ درس نظامی میں وفاق المدارس کے امتحانات میں بھی نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔اس سال انہوں نے اڑھائی ماہ کے دورانیہ کی ایک کلاس شروع کی ہے جس کا افتتاح راقم الحروف نے ۱۰ر جون کو کیا ہے اور یہ ۲۵ر اگست تک جاری رہے گی۔مولانا حافظ محمد یوسف کا ارادہ ہے کہ وہ اس کلاس کے طلبہ کو اڑھائی ماہ میں وفاق المدارس العربیہ کے درجہ اولیٰ کا پورا نصاب پڑھا دیں گے اور طلبا اس کا باقاعدہ امتحان دے سکیں گے۔اس کلاس میں انہیں مڈل، میٹرک اور بی اے کی سطح کے طلبہ میسر آئے ہیں اور انہیں اطمینان ہے کہ وہ ان شاء اللہ آسانی کے ساتھ مقررہ مدت کے دوران میں اپنا ہدف پورا کر لیں گے۔اگر ایسا ہو جاتا ہے تو میرے خیال میں یہ ایک نیا انقلابی تجربہ ہوگا اور اس سے ملک بھر کے دینی مدارس کو راستہ ملے گا اور وہ اپنے معمول کی تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ سرکاری اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ کو موسم گرما کی تعطیلات میں درس نظامی کا نصاب پڑھا کر اپنے طلبہ وفضلا کی تعداد میں معقول اضافہ کر سکتے ہیں۔

۱۷ر جون کو گوجرانوالہ شہر میں مجھے اسی طرح کے ایک کورس کے افتتاح کا موقع ملا جو ہمارے پرانے ساتھی مولانا حافظ گلزار احمد آزاد نے مسجد ختم نبوت ابوبکر ٹاؤن سیالکوٹ روڈ میں ''فہم دین کورس'' کے نام سے شروع کیا ہے اور اس پچیس روزہ کورس میں وہ شرکا کو قرآن کریم کی تعلیمات کے حوالے سے ضروریات دین کی تعلیم دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس سے ملتا جلتا ایک کورس ضلع نارووال میں ظفروال کے قریب ''اونچہ کلاں'' میں مولانا افتخار اللہ شاکر نے شروع کیا ہے جو ۱۵ر جون سے شروع ہو کر ۲۹ر جون تک جاری رہے گا اور اس کورس کا موضوع قادیانیت، انکار حدیث اور دیگر فتنوں کے خلاف نوجوانوں کو تیار کرنا ہے۔ یہ کورس انہی دنوں میں ہر سال ہوتا ہے اور اس میں مولانا منظور احمد چنیوٹی اور حضرت مولانا سید عبد القادر آزاد اہتمام کے ساتھ شریک ہوتے رہے ہیں۔ مجھے بھی کم وبیش ہر سال حاضری کا موقع ملتا ہے اور اس سال میں نے ۲۲ر جون جمعرات کو ظہر سے عشا تک کا وقت کورس کے شرکا کے ساتھ گزارنے کا وعدہ کیا ہے۔ ماشاء اللہ! اس طرح کے کورسز ملک کے مختلف شہروں میں اب سینکڑوں کی تعداد میں ہونے لگے ہیں اور مختلف مکاتب فکر کے ادارے ان کا انتظام کر رہے ہیں۔ گزشتہ روز میں نے ایک بینر عربی زبان کے ایک کورس کا بھی دیکھا جو ہمارے محترم دوست مولانا محمد بشیر سیالکوٹی کے مرکز کی طرف سے تھا۔ مولانا موصوف مسلکاً اہل حدیث ہیں، لیکن معتدل مزاج بزرگ ہیں اور مشترکہ دینی کاموں میں دلچسپی کے ساتھ شریک ہونے کے علاوہ مسلک کے اظہار و بیان میں بھی اعتدال کا دامن تھامے رہتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے مولانا حکیم عبد الرحیم اشرف رحمہ اللہ یاد آجاتے ہیں۔ وہ میرے بزرگ دوستوں میں سے تھے اور ہمیشہ شفقت فرماتے تھے۔ ساری زندگی ملی مسائل کے لیے جدوجہد میں گزاری، ذاکر و شاغل بزرگ تھے اور وحدت ملت کے لیے مسلسل سرگرم عمل رہتے تھے۔ مولانا محمد بشیر سیالکوٹی کو عربی زبان کے فروغ سے بطور خاص دلچسپی ہے اور مختلف سطحوں پر عربی زبان کے مختصر کورسز کراتے رہتے ہیں۔ ان کا مرکز اسلام آباد میں ہے لیکن اس مرکز کے تحت دوسرے شہروں میں بھی کورسز کا اہتمام کرتے ہیں۔

یہ مختصر کورسز عربی زبان کے حوالے سے ہوں، قرآن فہمی کے حوالے سے ہوں، ضروریات

دین کی تعلیم کے لیے ہوں یا عقائد کے تحفظ کے نقطہ نظر سے ہوں، وقت کی ایک اہم ضرورت ہیں اوران کی طرف دینی اداروں اور مراکز کا بڑھتا ہوا رجحان یقیناً ایک خوش آئند امر ہے، لیکن اس کے لیے چند امور کی طرف بروقت توجہ دینا ضروری ہو گیا ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ ان مختصر کورسز میں پڑھایا جانے والا مواد کیا ہو؟ کیونکہ یہ مواد اگر باہمی مشاورت سے طے ہوگا تو اس سلسلے کی ضروریات کی تکمیل کا ذریعہ ہوگا اور ہم آہنگی کا دائرہ بھی قائم رہے گا، لیکن اگر کیف ما اتفق ہر جگہ الگ الگ نصاب زیر تعلیم ہوگا تو ترجیحات میں تفاوت اور اہداف ومقاصد کا تنوع ضرور فکری وذہنی انتشار کا باعث بن سکتا ہے۔ ہمارے خیال می اس سطح پر جو امور سب سے زیادہ ضروری ہیں، انہیں درج ذیل ترتیب کے ساتھ ذکر کیا جا سکتا ہے:

☆ قرآن پاک صحیح تلفظ کے ساتھ اور تجوید کے بنیادی قواعد کے مطابق پڑھنا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے اور عوامی سطح پر اس کا اہتمام کم ہوتا ہے، اس لیے یہ کوشش کی جائے کہ ان کورسز کے شرکا کو صحیح تلفظ اور لہجے کے ساتھ قرآن کریم پڑھنے کی اس حد تک مشق کروائی جائے کہ وہ خود محنت کر کے قران کریم کی صحیح تلاوت کر سکیں۔

☆ نماز کے ضروری احکام ومسائل اور طریقہ وآداب کے علاوہ نماز میں پڑھے جانے والے وظائف، تسبیحات اور دعاؤں کا تلفظ صحیح کرانے کے ساتھ ساتھ ان کا ترجمہ بھی سکھایا جائے تاکہ نماز پڑھتے ہوئے نمازی ذہنی طور پر یہ محسوس کر رہا ہو کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے اور کیوں پڑھ رہا ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ، روزہ اور حج کے ضروری مسائل سے واقف کرایا جائے۔

☆ قرآن پاک کی چند سورتیں اور آیات اور ان کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ احادیث ترجمہ کے ساتھ یاد کرادی جائیں اور روزمرہ معمولات کے حوالے سے مختصر دعائیں بھی ترجمہ کے ساتھ یاد کرائی جائیں۔

☆ معاشرتی زندگی کے مسائل، خاندانی نظام کی اہمیت، باہمی میل جول کے شرعی آداب، چھوٹے بڑے کے حقوق وآداب اور انسانی حقوق کے اسلامی تصور واحکام سے متعارف کرایا جائے۔

☆ حلال وحرام کے مسائل اور ضروری احکام بتائے جائیں اور زندگی کے مختلف شعبوں کے حوالے سے حلال وحرام اور جائز وناجائز کے احکام ومسائل ذہن نشین کرائے جائیں۔

☆ وجود باری تعالیٰ، توحید، رسالت، قیامت، ختم نبوت، حجیت حدیث، مقام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور دیگر ضروریات کے حوالے سے عقائد سے روشناس کرایا جائے اور اہل السنۃ والجماعت کے متفقہ عقائد مناسب ترتیب کے ساتھ اہتمام سے پڑھائے جائیں۔

☆ فکر وتہذیب کی موجودہ عالمی کشمکش سے انہیں آگاہ کیا جائے اور فکری وتہذیبی مسائل کے حوالے سے اہل دین کے موقف اور جدوجہد سے انہیں روشناس کرایا جائے۔

ہمارا خیال ہے کہ اگر موسم گرما کی تعطیلات میں چالیس روز یا دو ماہ کے لگ بھگ دورانیہ کے ایسے کورسز کا اہتمام کر کے اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ اور طالبات کو ان میں شرکت کی ترغیب دی جائے تو ملک بھر میں دینی تعلیم کے فروغ اور دینی ماحول کے استحکام کی فضا قائم ہو سکتی ہے جو اسلام اور اہل دین کے خلاف عالمی میڈیا اور لابیوں کی ہمہ گیر یلغار کے ماحول میں دن بدن زیادہ ضروری ہوتی جا رہی ہے۔ میڈیا اور ذرائع ابلاغ جو کچھ کر رہے ہیں، اس کا علاج ہمارے پاس اس کے سوا کوئی نہیں ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ لوگوں کو دین کی تعلیم کے نظام سے وابستہ کر لیں اور معاشرہ میں قرآن وسنت کی تعلیم کو فروغ دینے کی کوشش کریں۔ عام مسلمانوں اور خاص طور پر اسکولوں اور کالجوں کے طلبا وطالبات میں دینی تعلیم کے فروغ اور مسائل واحکام سے واقفیت کا ذوق بیدار کرنے سے بڑی حد تک اس زہر کا تریاق ہو جائے گا جو عالمی میڈیا اور لابیاں مغربی تہذیب وفلسفہ اور ثقافت کے فروغ کے لیے مسلسل پھیلا رہی ہیں۔

ضروریات دین کی حد تک بنیادی تعلیم تو بہر حال ہر سطح پر ضروری ہے اور اس کے لیے ہر دینی ادارے اور مرکز کو کوئی نہ کوئی پروگرام ان تعطیلات میں ضرور بنانا چاہیے۔ باقی رہی بات درس نظامی کے پورے کورس کی تعلیم کی تو اگر ہمارا الشریعہ اکادمی کا ابتدائی تجربہ کامیاب ہو جائے تو یہ بہت خوشی اور پیش رفت کی بات ہوگی اور اس سے مستقبل کے بہت سے وسیع امکانات کا دروازہ کھلے گا، البتہ اس موقع پر دینی مدارس کے وفاقوں بالخصوص وفاق المدارس العربیہ پاکستان سے یہ

گزارش کرنے کو جی چاہتا ہے کہ وہ ملک بھر میں مختلف موسموں میں اسکولوں اور کالجوں کی سالانہ تعطیلات کے دوران میں ان کے طلبہ کو کسی نہ کسی درجہ میں دینی تعلیم سے آراستہ کرنے کا کوئی نظم ضرور قائم کریں اور وفاق کی طرف سے دینی مدارس کو ایسے مختصر کورسز کا ٹاسک دیں جن سے عام لوگوں کے دینی تعلیم کے ساتھ تعلق میں اضافہ ہو اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو قرآن وسنت کی تعلیم کے دائرہ میں شامل کیا جا سکے۔ انفرادی طور پر تو یہ رجحان ملک کے مختلف حصوں میں بڑھ ہی رہا ہے لیکن یہی کام اگر وفاق المدارس العربیہ اور دیگر دینی وفاقوں کی سطح پر ہوگا تو اس کی افادیت اور ثمرات میں کئی گنا اضافہ ہوگا اور وفاقوں کی تعلیمی جدوجہد میں ایک اہم پیش رفت ہوگی۔

(روزنامہ اسلام، ۲۰ جون ۲۰۰۴ء)

محراب ومنبر کے وارث اور محنت مزدوری

محترم راجہ انور صاحب کو شکایت ہے کہ محراب ومنبر کے وارث مزدوری کیوں نہیں کرتے؟ ان کی بڑی تعداد محنت مزدوری یا نوکری اور تجارت سے اپنا پیٹ کیوں نہیں پالتی؟ ان میں سے اکثر چندے اور قربانی کی کھالیں جمع کرنے کے بجائے جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر یا وزن اٹھا کر اپنی روزی کیوں نہیں کماتے؟

یہ شکایت نئی نہیں، بہت پرانی ہے اور جب مسجد اور مدرسہ نے ایک ریاستی ادارے کی حیثیت سے محروم ہوکر پرائیویٹ ادارے کی حیثیت اختیار کی ہے اور اسے اپنا وجود برقرار رکھنے اور نظام چلانے کے لیے صدقہ، زکوٰۃ، قربانی کی کھالوں اور عوامی چندے کا سہارا لینا پڑا ہے، تب سے یہ شکوہ زبانوں پر ہے اور مختلف طریقوں سے وقتاً فوقتاً اس کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔

مغل حکومت کے دور میں مسجد ومدرسہ کو ریاستی ادارے کی حیثیت حاصل تھی۔ ان کے اخراجات کی ذمہ داری ریاست پر تھی۔ درس نظامی ملک کا سرکاری نصاب تعلیم تھا اور عدالتوں میں اسلامی احکام وقوانین کی عمل داری تھی۔ جب اس سارے سسٹم کو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کی ناکامی کے بعد انگریزی سرکار نے لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا اور مساجد ومدارس کی بندش کے ساتھ ساتھ ان کے لیے مخصوص اوقاف ووسائل بھی ضبط کر لیے تو باقی سارے معاملات سے قطع نظر کم سے کم عام مسلمانوں کی عبادات کا نظام برقرار رکھنے اور ان کے لیے دینی تعلیم کا تسلسل قائم رکھنے کے لیے عوامی چندے اور زکوٰۃ وصدقات کے ذریعے سے مسجد ومدرسہ کے نظام کو چلانے کا رجحان پیدا ہوا اور کچھ اصحاب بصیرت نے غریب عوام کے سامنے جھولی پھیلا کر زکوٰۃ

وصدقہ اکٹھا کر کے، قربانی کی کھالیں جمع کر کے بلکہ ایک ایک گھر سے روٹی مانگ کر مسجد و مدرسہ کے اس نظام کو تباہ ہونے سے بچالیا، ورنہ تاشقند اور سمرقند میں ایسی مساجد میں نے خود دیکھی ہیں اور وہاں نمازیں ادا کی ہیں جو گزشتہ نصف بلکہ پون صدی کے عرصہ میں سیمنٹ کے گودام اور سینماہال کے طور پر استعمال ہوتی رہی ہیں۔ اگر ہمارے ہاں کے منبر ومحراب کے وارث کھالوں اور چندوں کے پیچھے نہ پھرتے تو یہاں بھی صورت حال تاشقند اور سمرقند سے مختلف نہ ہوتی۔

مسجد و مدرسہ مولوی اور چندہ کے اس نظام پر دو قسم کے حضرات کو اعتراض ہے اور ان کی شکایت کے پس منظر کو الگ الگ طور پر سمجھنا ضروری ہے۔ کچھ حضرات کو تو اس بات پر غصہ ہے اور وہ اپنے غیظ وغضب کو چھپانے میں کامیاب نہیں ہو رہے کہ یہ نظام ابھی تک بدستور قائم کیوں ہے؟ اور نہ صرف قائم ہے بلکہ مغرب اور اسلام کے درمیان گلوبل سولائزیشن وار میں ایک ناقابل تسخیر مورچہ کی حیثیت کیوں اختیار کیے ہوئے ہے؟ اور چونکہ اس نظام کے باقی رہنے بلکہ دن بدن ترقی کرنے میں ظاہری سبب یہی صدقہ زکوٰۃ، قربانی کی کھالیں اور چندہ ہے، اس لیے انہیں یہ سارا کچھ برا لگتا ہے، لیکن کچھ حضرات خیر خواہی اور خلوص کے جذبہ کے ساتھ بھی اس خواہش کا اظہار کر دیتے ہیں کہ علمائے کرام کو صدقہ وزکوٰۃ کے بجائے کوئی ہنر اپنا کر اپنی معیشت کا انتظام کرنا چاہیے۔ ایسے دوستوں کے پیش نظر انتہائی خلوص کے ساتھ یہ بات ہوتی ہے کہ منبر ومحراب کے وارثوں کا معاشرتی مقام بلند ہونا چاہیے اور انہیں لوگوں کا دست نگر ہونے کے بجائے خود کفیل ہو کر دینی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دینا چاہیے تاکہ ان کی بات میں زیادہ وزن ہو اور وہ زیادہ اعتماد کے ساتھ معاشرہ کی دینی قیادت کر سکیں۔

مگر منبر ومحراب کے وارثوں کے لیے اس خواہش کو پورا کرنا ممکن نہیں ہے اور اس کی وجہ بھی مدرسہ ومسجد کے اسی نظام کا تحفظ ہے۔ کیونکہ ایک طرف حافظ اور قاری کے ذاتی اور معاشرتی وقار کا مسئلہ ہے اور دوسری طرف مسجد و مدرسہ کے نظام کو باقی رکھنے کے تقاضے ہیں اور مولوی پوری ہوش مندی کے ساتھ آج بھی اپنے ذاتی مفاد پر مسجد و مدرسہ کے نظام کو ترجیح دے رہا ہے۔ ہم ان کالموں میں عرض کر چکے ہیں کہ ایک دور میں ریاست حیدر آباد دکن کے نواب نے جو اپنے دور

کے امیر ترین حکمران سمجھے جاتے تھے، دارالعلوم دیوبند کی انتظامیہ کو پیش کش کی کہ اگر دارالعلوم کے نصاب میں کچھ جدید مضامین کو بھی شامل کرلیا جائے تو وہ دارالعلوم کے اخراجات میں تعاون کرنے اور دارالعلوم کے فضلا کو اپنی ریاست میں ملازمتیں فراہم کرنے کے لیے تیار ہیں تو اس کے جواب میں مولانا رشید احمد گنگوہی نے یہ تاریخی جملہ کہہ کر اس پیش کش کو مسترد کر دیا تھا کہ ہم ریاست حیدر آباد کا نظام چلانے کے لیے نہیں، بلکہ مسلمانوں کی نماز، روزہ اور دینی تعلیم کا نظام باقی رکھنے کے لیے پڑھا رہے ہیں۔

ان کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ اگر ہم بھی اپنے مدارس میں پڑھنے والے طلبہ کو جدید تعلیم کا ٹچ دے کر ریاستی نظام کے کل پرزے بنا دیں تو پھر مسجدوں میں نماز کون پڑھائے گا؟ اور لوگوں کو قرآن کریم کی تعلیم کون دے گا؟ اس لیے اس دور کے اکابر علماء نے شعوری طور پر حکمت عملی کے تحت اپنے طلبہ کو جدید علوم اور ہنر وفن سے دور رکھا تاکہ وہ مسجد اور مدرسہ کے علاوہ کہیں فٹ نہ آسکیں اور عام مسلمانوں کا عبادات اور دینی تعلیم کا نظام چلتا رہے، اس لیے یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ قیام پاکستان کے بعد اسلامی نظام کے لیے رجال کار فراہم کرنے کے نقطہ نظر سے دینی مدارس کو اپنے نصاب ونظام میں ضروری تبدیلیاں کرنا چاہیے تھیں اور ہم خود اس پر مسلسل معروضات پیش کر رہے ہیں مگر جہاں تک مسجد ومدرسہ کے موجودہ نظام کی افادیت اور اس کے معاشرتی ثمرات کا تعلق ہے، اس کا دارومدار ظاہری طور پر اس صدقہ وخیرات اور قربانی کی کھالوں پر ہے۔ اس سسٹم کو طنز وطعن کا نشانہ بنا کر اس کی نفی کرنا عام مسلمانوں کی عبادات اور دینی تعلیم کے نظام کو سبوتاژ کرنے کی شعوری یا غیر شعوری کوشش کے سوا اور کسی عنوان کا متحمل نہیں ہوسکتا۔

راجہ انور صاحب محترم نے ایک واقعہ کا حوالہ بھی دیا ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سوال کرنے والے شخص کو کلہاڑی دے کر جنگل سے لکڑیاں کاٹنے اور محنت کر کے پیٹ پالنے کی ترغیب دی تھی۔ یہ واقعہ درست ہے اور کسی بھی تندرست شخص کے لیے یہی حکم ہے تاکہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کے بجائے محنت مزدوری کر کے روٹی کمائے لیکن یہاں ایک عمومی رویہ اور الجھن کا حوالہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ کچھ لوگ دور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے انفرادی

واقعات کا سہارا لے کر ان کے حوالہ سے اپنے جذبات وافکار پیش کرنے کی کوشش تو کرتے ہیں مگر اس دور کے سسٹم اور نظام کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ جس مسئلہ پر ہم بات کر رہے ہیں، اس کی حیثیت جناب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاے راشدین کے رائج کردہ مجموعی نظام میں کیا تھی؟ اس لیے اس سلسلہ میں دو حوالے سامنے لانا مناسب خیال کرتا ہوں۔

ایک خود جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ہے کہ ان کا اپنا ذریعہ معاش کیا تھا؟ اور اگر راجہ صاحب کو مسلمان حکمرانوں کی خود ان کے بقول لوٹ مار کی کہانی پھر سے یاد نہ آ جائے تو یہ گزارش ہے کہ ضابطہ اور قانون کے طور پر جنگوں میں حاصل ہونے والے مال غنیمت کا ۱/۵ حصہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے خاندان کے اخراجات کے لیے مخصوص ہوتا تھا، یعنی کسی بھی جنگ میں حاصل ہونے والے کل مال غنیمت کا بیس فیصد جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے متعین رہتا تھا جس سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اہل خانہ کے اخراجات پورے ہوتے تھے۔ یہ سلسلہ آخر وقت تک جاری رہا حتیٰ کہ اسی مال غنیمت میں سے ایک بہت بڑے باغ فدک کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ملکیت سمجھتے ہوئے حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے خلیفہ اول حضرت ابوبکر سے اسے وراثت کے طور پر انہیں منتقل کرنے کا مطالبہ کیا تو حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا کہ یہ باغ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت کے طور پر نہیں دیا جا سکتا بلکہ یہ بیت المال کی ملک رہے گا، البتہ اس کی آمدنی سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات اور دیگر اہل خانہ کے اخراجات بدستور ادا کیے جاتے رہیں گے۔

دوسرا حوالہ یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر خلیفہ بنے تو ان کا معاملہ یہ تھا کہ مدینہ منورہ سے تھوڑے فاصلہ پر سنح نامی جگہ میں ان کی کپڑے کی کھڈیاں تھیں اور وہ کپڑا بیچ کر گزارا کیا کرتے تھے۔ خلیفہ بننے کے بعد وہ حسب معمول کپڑوں کی گٹھڑی اٹھا کر بازار کی طرف چلے تو حضرت عمرؓ نے انہیں روک لیا کہ آپ کاروبار میں مصروف رہیں گے تو لوگوں کے معاملات کون نمٹائے گا؟ اس لیے آج کے بعد آپ

کاروبار نہیں کریں گے اور کاروبار سلطنت کے لیے خود کو فارغ رکھیں گے۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ کی تجویز پر خلافت راشدہ کی مجلس شوریٰ کا پہلا اجلاس ہوا جس میں حضرت صدیق اکبرؓ کے لیے بیت المال سے وظیفہ مقرر کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور اسی سے فقہاے کرام نے یہ اصول اخذ کیا کہ جو شخص بھی امت کے اجتماعی کاموں کے لیے وقف ہو جائے، اس کے اخراجات اور ضروریات زندگی کی کفالت بھی اجتماعی آمدنی میں سے ہوگی۔ چنانچہ اسی اصول کے تحت حاکم، قاضی، مجاہد، معلم اور امام وغیرہ حضرات کی تنخواہ اجتماعی آمدنی سے ادا کی جاتی ہے اور یہ صرف ہمارے ہاں نہیں، بلکہ دنیا کے ہر نظام میں یہی اصول ہے اور اجتماعی کاموں کے لیے وقت دینے والے حضرات کے اخراجات اجتماعی آمدنی میں سے ہی ادا کیے جاتے ہیں۔ اب ایک ڈپٹی کمشنر کو دیکھ لیجیے۔ اس کی تنخواہ عام لوگوں سے جمع کی گئی رقم سے ہی دی جاتی ہے اور ایک مدرسہ کے مہتمم کی تنخواہ بھی عام لوگوں سے جمع کی گئی رقم سے ہی دی جاتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ڈپٹی کمشنر کے لیے جمع کی جانے والی رقم ٹیکس کہلاتی ہے اور ریاستی ادارے لا اینڈ آرڈر کی قوت سے اسے جمع کرتے ہیں اور مہتمم مدرسہ کی تنخواہ کے لیے جمع ہونے والی رقم کو چندہ کہا جاتا ہے جو لوگ رضا کارانہ طور پر پیش کر دیتے ہیں۔

بات کچھ لمبی ہوتی جا رہی ہے، لیکن اس حوالہ سے ایک اور بات کی طرف توجہ دلانا بھی ضروری محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ مولوی صاحبان صرف پانچ وقت کی نمازیں پڑھا کر سارا دن فارغ بیٹھے رہتے ہیں اور لوگوں کے چندوں پر عیش کرتے ہیں، اس لیے اس فراغت اور عیش کی جھلک بھی سامنے آ جائے تو مناسب ہوگا اور اس کے لیے میں اپنے ذاتی مشاہدہ کی ایک مثال پیش کرنا چاہوں گا۔ ہمارے ہاں مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں سرگودھا سے تعلق رکھنے والے قاری محمد ریاض صاحب امام ہیں جن کی ذمہ داری یہ ہے کہ انہوں نے پانچ وقت نمازوں کی امامت کے لیے موجود رہنا ہے اور اس کے علاوہ ان کی روزمرہ ذمہ داری کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ صبح اذان فجر سے پہلے اٹھ کر وہ قرآن کریم پڑھنے والے بچوں کو پڑھاتے ہیں، جو اذان فجر سے لے کر قاری صاحب کی نگرانی میں ۱۱ بجے دن تک پڑھتے ہیں۔ پھر

ظہر سے عصر تک پڑھاتے ہیں اور اس کے بعد مغرب سے عشا تک پھر سبق یاد کرنے والے بچوں کی نگرانی کے لیے انہیں بیٹھنا ہوتا ہے۔ اس ''فراغت'' کے عوض میں انہیں جو ''عیش'' فراہم کی جاتی ہے، اس پر بھی ایک نظر ڈالیں۔ انہیں اسلام آباد کے چوتھے درجے کے ملازمین کے معیار کا ایک کوارٹر مسجد کی طرف سے دیا گیا ہے جس میں وہ اپنے بیوی بچوں سمیت رہتے ہیں۔ پانی، بجلی، گیس کا بل ان کے ذمے نہیں ہے اور انہیں مبلغ تین ہزار روپے تنخواہ دی جاتی ہے، وہ بھی اس سال رمضان المبارک میں انتظامیہ سے ضد کر کے میں نے کرائی ہے، ورنہ اس رمضان سے پہلے تک انہیں صرف دو ہزار روپے ماہانہ تنخواہ ملتی رہی ہے۔

اور اگر راجہ صاحب محترم زیادہ ناراض نہ ہو جائیں تو ڈرتے ڈرتے ایک اور بات کہنے کو بھی جی چاہتا ہے کہ نیکی اور عبادت صرف نماز پڑھانا اور بچوں کو دینی تعلیم دینا ہی تو نہیں ہے۔ عدالت میں بیٹھ کر لوگوں کو انصاف مہیا کرنا بھی نیکی ہے اور اسے عبادت کا درجہ حاصل ہے اور جس طرح قرآن پڑھانے کا کوئی معاوضہ نہیں ہو سکتا، اسی طرح انصاف کی بھی کوئی قیمت نہیں ہوتی، اس لیے تھوڑی سی ہمت کر کے وہ یہ بھی فرما دیں کہ عدالت کے منصب پر بیٹھ کر لوگوں کو انصاف مہیا کرنے والے مزدوری کر کے یا نوکری اور تجارت کر کے اپنا پیٹ کیوں نہیں پالتے اور لوگوں سے وصول کی جانے والی اجتماعی رقم سے تنخواہ حاصل کرنے کے بجائے جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر یا وزن اٹھا کر اپنی روزی کیوں نہیں کماتے؟

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد، ۱۰/ مارچ ۲۰۰۰ء)